اسلام اور انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد العلماء سیّد علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم
اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَ الصَّلٰوۃُ عَلٰی
سَیّدِ المُرسَلِینَ وَ آلِہِ الطَّاھِرِین۔

اسلام کا پیغام توحید اور عالمِ انسانیت پر اس کا اثر

اسلامی تعلیمات میں سب سے مقدم چیز توحید ہے یعنی اللہ کو ایک ماننا اسی کے لئے پیغمبر اسلام نے تمام زحمتیں اور مشقتیں برداشت کیں۔

اگر پیغمبرؐ ان جاہل، بت پرست قبائل عرب سے یہ کلمہ پڑھوانا چاہتے کہ ''اللہ الٰہ'' تو جتنے قریش تھے، جتنے عرب تھے، جتنی دنیا اس وقت تھی، سب کے سب اس کے لئے آسانی سے تیار ہوجاتے۔ اگر اللہ کو فقط منوانا منظور ہوتا تو جن کا ذوق عبادت تین سو ساٹھ کو مان رہا تھا ان کو تین سو اکسٹھ کے ماننے میں کیا عذر ہوسکتا تھا اور پھر وہ مشرکین عرب اللہ کو مانتے تو تھے ہی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ''**لئن سئلتھم من خلق السّموات والارض لیقولن اللّٰہ**'' اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔

دوسری جگہ ''**لئن سئلتھم من خلق السّموات والارض وسخّر الشّمس والقمر لیقولن اللّٰہ**'' ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا ہے تو کہیں گے کہ اللہ نے ''**لئن سئلتھم من انزل من السّمآء ماء فاحییٰ بہ الارض بعد موتھا لیقولنّ اللّٰہ**'' ان سے پوچھو کہ کون آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو زندہ بنا دیتا ہے تو کہیں گے کہ اللہ۔ معلوم ہوا کہ مشرکین قریش سے اس بات پر جہاد نہ تھا کہ وہ اللہ کو نہ مانتے ہوں۔ صرف اللہ کے ماننے نہ ماننے کا سوال نہ تھا۔ وہ چیز جو محل اختلاف تھی اور جس نے رسولؐ کے مقابل ان کو صف آرا بنا دیا تھا وہ یہ تھی کہ اسلام کہتا تھا اس کے ایک خدا کے بتلائے ہوئے کے سوا کسی کو نہ مانو، بس یہ غیر اللہ کا نہ ماننا ان کے لئے دشوار تھا۔ اس کا پیغام تھا ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' اللہ کا ثبوت بعد کو ہوگا پہلے ہر غیر کی نفی کرلو۔ اس نفی کی راہ سے اس کے اقرار تک پہنچو۔ بس یہ درمیان کی خندق عبور کرنا ان پر گراں تھا۔ وہ کسی کو اللہ کے سوا نہ مانیں یہ گوارا نہ تھا۔ رسولؐ پر الزام یہی وارد کرتے تھے ''**اجعل الالھۃ الھاً واحداً ان ھذا الشئی عجاب**'' انھوں نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ تو عجیب بات ہے۔ اس ایک کو بس ایک ماننا ہی دشوار تھا اس کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اور پیغمبرؐ کی آواز یہی تھی۔ ''**قولوا لَا الٰہ الّا اللّٰہ تفلحوا**'' مانو کہ کوئی خدا نہیں سوائے اللہ کے، تمہارا ہی بھلا ہوگا۔ وہ جاہل عرب کیا سمجھتے کہ ایک ماننے میں ہمارا فائدہ ہے۔ مگر اب چودہ سو سال میں دنیا کافی ترقی کرچکی ہے، اب اسے یہ سمجھنا آسان ہے کہ توحید عالم انسانیت کو کیا کیا فیض پہنچاتی ہے؟ اس وقت دنیا اخوت اور مساوات کے لئے تڑپ رہی ہے اور مضطرب ہے کہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوں یہ تقسیم دولت مساوی طور پر اسی لئے چاہی جارہی ہے کہ مالدار اور غریب طبقے کا فرق ختم ہوجائے، امیر غریب کو حقیر نظر سے دیکھتا ہے، اس کو دبانے کے لئے آمادہ رہتا ہے، حقوق دینے میں تکلف کرتا ہے، سمجھتا ہے میں جینے کا حقدار

ہوں اس لئے کہ میں امیر ہوں اور یہ مرنے کا حقدار ہے اس لئے کہ یہ غریب ہے، اس مساوات کے لئے جو علاج تجویز کیا گیا ہے کیا یہ واقعی مرض کے دفعیہ کا سبب ہے؟ یا صرف طفل تسلی ہے۔ اگر تفرقہ فقط امارت اور غربت کا ہوتا تو دولت برابر سے تقسیم کر کے سمجھ لیتے کہ مساوات قائم ہوگئی، مگر فرق فقط دولت اور غربت کا نہیں ہے ایک بازوؤں کی طاقت کے لحاظ سے بھی قوی ہے اور ایک ضعیف، قوم وقبیلہ کی کثرت کے لحاظ سے بھی فرق ہے، ایک کا خاندان بڑا ہے، اس لئے اس کے حمایتی زیادہ ہیں، ایک کا کوئی نہیں اس لئے بے یار و مددگار ہے اس کے علاوہ ایک چیز ہے وجاہت، سابقہ اثرات، یا باپ دادا کے خدمات سے ایک شخص کا دلوں پر اثر ہے، دوسرا اس وقار سے محروم ہے، پھر دماغی فوقیت میں ایک بڑھا ہوا ہے، دوسرا ذہانت میں اس سے کم ہے، جس طرح دولتمند اپنی امارت سے غریب کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح طاقتور قوت سے اور قوم قبیلہ والا کثرت سے دباتا ہے، صاحب وجاہت اپنی وجاہت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، دماغی فوقیت والا ایسی اسکیم بناتا ہے کہ دوسروں کا ہمدرد بن کر اپنی گرفت مضبوط کرلے اور دوسرے اپنی سادہ لوحی سے اس کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ خیر دولت تو بیرونی چیز ہے آدمی کا جز نہیں ہوتی اس کو لے لینا اور برابر سے تقسیم کردینا کوئی مشکل نہیں۔ اسے چور اور ڈاکو لے جاتے ہیں۔ پھر کوئی قانون بنا کر لے لینا کیا مشکل ہے؟ مگر طاقت جسمانی کو کیا کیا جائے گا کیا اسے بھی طاقتوروں سے کھینچ کر کمزوروں پر تقسیم کیا جائے گا؟ قوم اور قبیلہ کی کثرت کو کیا کیا جائے گا۔ کیا ایک خاندان کے افراد کو تقسیم کیا جائے گا کہ باپ کسی کے حصے میں جائے، بھائی کسی کے حصّے میں اور چچا اور ماموں کسی کے ہوجائیں، وجاہت کو روداروں سے لے کر کیوں کر تقسیم کیا جائے گا؟ دماغی فوقیت کو کیا کیا جائے گا؟ کیا اسے انجکشن لگا کر سادہ لوحوں کے دماغوں میں داخل کیا جائے گا؟ کچھ نہیں ہوسکتا، تو صرف دولت تقسیم کر کے یہ سمجھ لینا کہ مساوات ہوگئی، یہ طفل تسلی نہیں تو اور کیا ہے؟

مبلغ اسلام، جو نباضِ فطرت بشر تھا، اس نے محسوس کیا کہ ان تفرقوں کا خارجی طور پر مٹانا تو ناممکن ہے جیسے زمین میں نشیب وفراز ہے اور سہل وجبل میں فرق ہے، درختوں کے قد و قامت میں کوتاہی و بلندی ہے، پتھروں میں بھی کوئی سخت ہے اور کوئی نرم، اسی طرح افراد بشر میں صلاحیتوں کا تفرقہ ہے۔ لہٰذا عملی طور سے یہ فرق مٹانا ناممکن ہے۔ مگر ذہنیت کی تشکیل اس طرح ہو کہ ایک طاقت رکھنے والا کمزور کو دبائے نہیں بلکہ اس کا محافظ بن جائے۔ صاحب قوم وقبیلہ بیکس افراد کو پائمال نہ کرے، بلکہ اپنے قبیلہ سے اس کا حامی ہوجائے۔ صاحب وجاہت دوسروں کو نقصان نہ پہنچائے بلکہ اپنے اثر کو دوسروں کی خدمت میں صرف کرے، اور دماغی فوقیت والا دوسروں کے لئے ضرر رسانی کے تدابیر نہ سوچے بلکہ نفع رسانی کے تدابیر پر غور کیا کرے۔ اگر ایسا ہوجائے تو ایک فرد کو ملی ہوئی اللہ کی نعمت تمام نوع انسانی کا سرمایہ بن جائے اور پھر دولتمندی بھی لعنت نہ رہے۔ اور اگر ذہنیت کی تشکیل اس طرح نہ ہوئی تو لاکھ دولت کو برابر تقسیم کر دیا جائے پھر بھی اپنی طاقت سے، وجاہت سے، کثرت قبیلہ سے، ذہانت سے ایک دوسرے پر ظلم وستم ڈھائے گا اور اس دولت کی تقسیم سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اب یہ ذہنیت کیوں کر پیدا ہو؟ یہ ذہنیت قائم ہوگی احساس سے، اخوت سے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا رفتارِ عمل کو الٹا لئے جاری ہے۔ وہ مساوات کو بنیاد اخوت بنانا چاہتی ہے حالانکہ در اصل مواخات بنیاد مساوات ہے۔ پہلے ذہن انسانی میں اخوت کا احساس قائم ہو پھر عملی مساوات اس پر مرتب ہو سکے گی، ضمیر کی تحریک سے، قانون کے دباؤ سے نہیں۔ اختیاری مساوات صحیح بنیادوں پر قائم ہوگی۔ احساسِ اخوت سے اس پر جو مساوات کی عمارات بلند ہوگی وہ ایک مضبوط بنیاد پر قائم ہوگی۔ اور بغیر اس احساس کے جو مساوات کی عمارت بنے گی۔ ریگ پر قائم شدہ دیوار کے مانند بے بنیاد ہوگی۔

اب اس پر غور کرنا ہے کہ احساسِ اخوت کیوں کر پیدا

ہوتا ہے؟ ہم اپنے روز مرّہ میں کتنی دفعہ بھائی جان، بھائی صاحب اور مجمع میں ''بھائیو'' کے الفاظ صرف کرتے ہیں۔ کبھی یہ بھی سونچا کہ دو آدمی باہم بھائی بھائی کیوں کر ہوتے ہیں؟ اخوت کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف منسوب ہوگی تو اس کے اجزاء میں برابری بھی پیدا ہوجائے گی اور برابری بھی۔ سگے بھائی بہن کیوں آپس میں اخوت رکھتے ہیں؟ اس لئے کہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، اور ایک ماں باپ کے دس بیٹے ہوں، تو دسوں بھائی، بیس ہوں تو بیس اور پچاس ہوں تو پچاس، یعنی جتنے وسیع حلقہ میں ایک کا قدم آئے گا اتنے ہی وسیع حلقہ میں برادری قائم ہوگی۔

دیہات میں محاورہ ہے ''یہ ہماری برادری کے ہیں'' اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ایک مورث اعلیٰ کی نسل، یعنی پانچ چھ پشتوں پر جا کر ایک نمایاں شخص ہے جس پر کئی خاندانوں کا سلسلہ جا کر منتہی ہوتا ہے، اس ایک مورث کی نسل ایک برادری ہوگئی، اس سے ظاہر ہے کہ جتنی دور پر جا کر ایک کا احساس پیدا ہوجائے وہیں سے برادری قائم ہوجائے گی۔

''یہ ہمارے ہم وطن ہیں'' کیا مطلب ہے؟ ایک دیش کے باشندے۔ وطن کے جذب کا تصوّر اس وقت بڑھ جاتا ہے جب پردیس میں زندگی گذارنے کی نوبت آئے۔ چاہے جب اپنے وطن میں تھے تو صاحب سلامت بھی باہم گر نہ تھی، مگر پردیس میں دیکھا تو دل تڑپ گیا، جی چاہا اس کے پاس جائیں، باتیں کریں، یہ ہے وطنیت کا جذب۔

اس کے بعد بیسویں صدی میں آفتاب کی سمت کے لحاظ سے رشتہ قائم ہوا۔ یہ مشرق ہے اور وہ مغرب۔ جتنے ممالک مشرق میں ہیں، ایک رشتہ میں منسلک، جتنے ممالک مغرب میں ہیں، وہ ایک رشتہ میں۔ مغرب والے چاہے آپس میں اختلاف رکھتے ہوں مگر ہمارے مقابلہ میں سب ایک ہیں۔ اب مسائل پر غور یوں ہوتا ہے کہ کون بات مشرق کے لئے مفید ہے اور کون بات مغرب کے لئے۔ اسی طرح متعدد ممالک اس لئے متحد ہوجاتے ہیں کہ وہ ایک سمت میں واقع ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بے چین ہے اس ایک کے لئے جو وسیع سے وسیع حلقہ میں ذریعۂ الفت بن سکے۔ مگر یاد رہے کہ یہ سب اتحاد کے مرکز افتراق کا پیش خیمہ ہیں، اس لئے کہ جب ایک خاندان میں ایکا ہوگا تو دوسرے خاندان کے خلاف محاذ قائم ہوگا۔ جب ایک ملک والوں میں اتحاد ہوگا تو دوسرے ملک والوں کے خلاف محاذ قائم ہوگا۔ اس لئے غیر ملکیوں کی اکثر یہ کوشش رہی ہوگی کہ ملک والوں میں اتحاد نہ ہو، یہاں تک کہ جانے بھی لگو تو ایسا کر جاؤ کہ ہمیشہ لڑتے رہیں۔ جب ایک سمت والوں میں اتفاق ہوگا تو دوسری سمت والوں کے خلاف محاذ ہوگا، تو ہر اتحاد اختلاف کا پیش خیمہ ہے، اس لئے کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائی گئی ہیں، لہٰذا ہر دیوار ادھر والوں کو ایک کرتی ہے اور ادھر والوں کو جدا کرتی ہے۔ اسلام جو عالمگیر اتحاد کا پیغام لے کر آیا تھا اس نے اتحاد کی درمیانی دیواروں کو ڈھا کر ایک ایسا وسیع احاطۂ اتحاد کا قائم کیا جس میں سمت، ملک، نسل، رنگ کسی طرح کی تفریق نہ ہو اور وہ خدائے واحد کا اتحاد ہے۔ آخر جب کہ ایک ماں باپ کی اولاد بھائی بھائی ہے، ایک مورث اعلیٰ کی نسل بھائی بھائی ہے، ایک ملک کے باشندے اور ایک سمت کے رہنے والے بھائی بھائی ہیں تو ایک خالق کے پیدا کئے ہوئے اور ایک خدا کے بندے بھائی بھائی کیوں نہ ہوں؟ مگر ظاہر ہے کہ بھائی کے حقوق کا لحاظ وہی کرے گا جو باپ کو یاد رکھے گا اگر باپ کو یاد نہ رکھا، تو بھائی کا حق کیسا؟ اسی لئے اسلام نے پوری طاقت صرف کردی اللہ کی یاد قائم کرنے میں۔ اسی لئے رسولؐ فرمارہے تھے ''قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوا'' اللہ کو ایک مانو تو تمہارا بھلا ہوگا، یعنی اس کے ذریعہ سے تمہیں ایک مرکز وحدت تک رسائی ہوگی۔ یہ مقصدِ وحدتِ عالمِ انسانی کا صرف خدا کے مان لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا، جب تک اسے ایک بھی نہ مانا جائے، اس لئے تمام طاقت صرف کی گئی اللہ کے ایک منوانے میں۔ آج دنیا جو پریشان وسرگرداں ہے، امنِ عالم قائم کرنے کے لئے کانفرنسیں

منعقد ہو رہی ہیں، اجتماعات ہوتے ہیں اسی مقصد کی خاطر مگر ہر کوشش امن تمہید جنگ بنتی ہے اس لئے کہ اجتماع ہوتا ہے امنِ عالم کا مقصد بتا کر، تقریروں میں امن، تحریروں میں امن، کاغذ پر امن، اسٹیج پر امن۔ مگر دل میں ہر ایک کے ہے مَنْ، مشترک مفاد کسی کے پیشِ نظر نہیں، ہر ایک سونچتا ہے میرے ملک میں میری جماعت، میری قوم کا فائدہ زیادہ کیوں کر ہو سب یکجا بیٹھتے ہیں پہلو سے پہلو ملائے ہوئے مگر دماغ سب کے الگ نقطۂ نظر، اور نصب العین سب کے جدا۔

حقیقت میں یہ کوشش امن اور گفتگوئے مصالحت بھی ایک جنگ ہی ہے۔ وہ جنگ جو میدان میں ہوتی ہے طرح طرح کی توپوں، مشین گنوں، اور مختلف قسم کے بموں سے ہوتی ہے اور یہ جنگ ہے جو دماغوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ مقابلہ اس کا ہے کہ کون ایسا سیاست داں ماہر ہے جو اپنے نفسانی اغراض پر گہرے سے گہرا ملمّع کر سکتا ہے جس کو ساتھ والے تاڑ نہ سکیں، اب جو ان میں زیادہ ماہر سیاستداں ہوا، اسی کا فارمولا تسلیم کر لیا گیا، مگر ملمّع کہاں تک رہے گا۔ کچھ عرصہ بعد دوسروں کو اندازہ ہوا کہ اس سے ایک زیادہ فائدہ اٹھا لے گیا وہیں سے معاہدہ توڑنے کی فکر پیدا ہوئی مگر اس طرح کہ عہد شکنی کا الزام دوسرے پر آئے خود حامئ امن بنے رہیں اور اگر کوئی دوسرے کو بیوقوف نہ بنا سکا تو نشستند و گفتند و برخاستند کا اعلان ہو گیا کہ کچھ طے نہیں ہوا، کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ مشترک مفاد سامنے نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت ہوتا جب دونوں میں ایک رشتہ ہوتا، مگر یہاں تو وہ سمجھتا ہے کہ میں مشرق کا رہنے والا ہوں مجھے مشرق کی حمایت کرنا چاہئے اور دوسرا سمجھتا ہے کہ میں مغرب کا ہوں مجھے مغرب کی حمایت کرنا چاہئے۔ اسلام نے مشرق اور مغرب دونوں کے درمیان نقطۂ مشترک کا پتہ دیا۔ حالانکہ جب قرآن آیا ہے، تمدن کہاں تک پہنچا تھا؟ گھروں سے مل کر گھرانے اور گھرانوں سے مل کر قبائل بنے تھے اور بس ہر قبیلہ اپنے مفاد کو سونچتا تھا۔ اس کے آگے عرب میں ترقی کا مظاہرہ نہ تھا، ہاں روم و فارس نے قبائلی نظام سے آگے بڑھ کر سلطنت کی شکل اختیار کی تھی۔ رفتہ رفتہ قدم ترقی آگے بڑھے، یہ آج سے صرف دو ایک صدی کی بات ہے کہ مشرق و مغرب کا تخیّل قائم ہوا ہے۔ یعنی ایشیا اور یورپ کی وحدتیں قائم ہوئی ہیں۔ اب قائل ہونا پڑے گا اعجاز قرآن کا کہ اس نے چودہ سو سال قبل اللہ کی وحدت کا جو تصور پیش کیا تو کہا: ''رَبُّ المَشارِقِ وَالْمَغَارِب'' معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک وقت میں دو حصوں میں دنیا کا بٹوارہ ہوگا، مشرق و مغرب میں۔ اس نے بتایا کہ مشرق اور مغرب بھی ایک نقطۂ مشترک ہے اور وہ خالق ہے جس نے دونوں کو پیدا کیا ہے۔ اس موجودہ رفتار سے تمام عالم کے مستقبل کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

مادّی تاریخ کی رو سے عالم کی ابتدا دورِ وحشت سے ہوتی ہے۔ اس دورِ وحشت میں احساسِ اجتماعیت بالکل نہ تھا بلکہ ہر فرد کی دنیا الگ تھی۔ پھر افراد سے مل مل کر گھر بنے، گھروں سے گھرانے بنے، گھرانوں سے قبائل بنے، قبائل سے حکومتیں، حکومتوں سے شہنشاہیتیں اور شہنشاہیتوں نے مل کر اب سمتیں بنالیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترقی کی رو اسی رخ پر ہے کہ کثرتیں مل مل کر وحدتوں کی شکل میں آتی جائیں۔ اب وہ منزل آگئی ہے کہ تمام عالم دو وحدتوں میں تقسیم ہے۔ ظاہر ہے کہ دو کے بعد ایک کی منزل ہے، دو اور ایک کے بیچ میں کوئی عدد نہیں ہے تو دنیا کی آئندہ ترقی کا قدم کیا ہو سکتا ہے؟ صرف یہی کہ توحید تمام عالم پر چھا جائے ''لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّينِ كُلِّه'' یہ وہی وقت ہوگا جب اس نقطہ کا تصور عام ہو جائے گا جو سب میں مشترک ہے۔ وہ نقطہ ''معرفتِ خالق'' ہے۔ اسی کے صحیح تصور سے اخوت قائم ہوگی، اور اخوت ہی مساوات کی بنیاد ہے۔ اسلام نے بھائی بھائی ہونے پر زور دیا ''اِنَّمَا المُؤْمِنُونَ اِخْوَة'' اگر اس سے صرف محبت باہمی کا اظہار ہوتا تو اس کے لئے بہت سے رشتے تھے، باپ بیٹے کا رشتہ سب سے زیادہ محبت کا رشتہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹوں کو اپنی اولاد سمجھو اور بڑوں کو اپنا باپ سمجھو اور ہم سنوں کو

بھائی سمجھو، مگر ان سب رشتوں میں بھائی کا رشتہ منتخب کیا، کیوں؟ اس لئے کہ جتنے اور رشتے ہیں سب میں ادھر کے رشتے اور ادھر سے رشتہ اور۔ وہ اس کا باپ تو یہ تو اس کا باپ نہیں، بلکہ بیٹا ہے۔ یہ اس کا چچا ہے تو وہ اس کا بھتیجا ہے، چچا نہیں ہے۔ مگر بھائی وہ رشتہ ہے کہ جو ادھر سے رشتہ ہے وہی ادھر سے بھی، جہاں رشتے دونوں طرف کے مختلف ہیں، وہاں حقوق وفرائض الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ یہ باپ ہے اور وہ بیٹا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ حقوق ہوں جو اس کے نہ ہوں، مگر جب کہ رشتہ دونوں طرف سے ایک ہے تو بھائی ہونے کے لحاظ سے جو اس کے حقوق وفرائض مانے جائیں گے، وہی اس کے حقوق وفرائض ماننا ہوں گے، اور یہی وہ مساوات ہے جس کا ''اسلام'' علمبردار ہے۔

انسانی معاشرہ کا سنگِ بنیاد

انسان سے تمام چیزوں میں قریب تر خود اس کی ذات ہے۔ یہ فطری چیز ہے کہ جو شئے قریب تر ہوگی سب سے پہلے اسی سے الفت اور محبت پیدا ہوگی، اس لئے ذاتی محبت کسی شئے سے اپنی ذات کے سوا نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ جس سے محبت ہوگی، اپنی ذات کے واسطے سے ہوگی یعنی اس لئے کہ وہ میرا ہے ''میں کے معنی اپنی ذات'' اور میرا'' اس تعلق کا اظہار ہے جو اپنے ساتھ ہے، معلوم ہوا کہ محبت کا سبب وہ رشتہ ہوتا ہے جو اپنی ذات کے ساتھ ہو۔ جتنا یہ رشتہ قوی ہوگا اتنی ہی محبت زیادہ ہوگی۔ یہ ''میرا'' کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی بالواسطہ۔ اسی سے قرابت میں دور اور قریب کے حدود قائم ہوتے ہیں۔ یہ محبت کا اصلی سرچشمہ ہے، جتنے ہمارے افعال ہیں وہ رجحانات اور میلانِ طبع کے ماتحت ہیں اور میلانِ طبیعت کا اصل منبع محبت ہے لہٰذا جتنے بھی ہمارے دوسروں کے ساتھ معاشرت میں حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق کے مظاہرات ہیں، وہ سب اسی محور پر گردش کرتے ہیں، اب جس وقت ہم مادّی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے قریب اور گردوپیش جو نظر آتے ہیں وہ ماں، باپ، بھائی عزیز اور ہمسائے ہیں، مادی حیثیت سے اپنی ذات کو بیچ میں رکھ کر جب آدمی خطوطِ الفت کھینچتا ہے تو وہ اس کے اردگرد چکّر لگانے لگتے ہیں۔ ''یہ ہے میرا باپ، یہ ہے میری ماں، یہ ہے بھائی، یہ ہے میرا عزیز، یہ ہے میرا پڑوسی، یہ جتنے خطوط ہیں ذات کو درمیان میں رکھ کر ادھر ادھر کھینچنا شروع ہو جاتے ہیں اور چونکہ اپنی ذات محدود ہے اس لئے یہ خطوط محبت بھی حدودِ مکان وزمان میں اسیر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تک یہ خط اتنا نزدیک ہے کہ نگاہِ توجّہ مبذول ہو سکے، وہاں تک تو رشتہ ہے اور جہاں سے خط اتنا دور ہو گیا کہ نگاہِ توجہ وہاں تک نہیں جاتی، وہیں سے رشتہ نہ رہا۔ وہ کون ہیں؟ چچازاد بھائی۔ وہ کون ہیں؟ دور کے عزیز ہمارے گاؤں کے قصبہ کے شہر کے، وہ کون؟ ہمارے ہم مذہب یا ہم قبیلہ، وہ کون؟ کوئی نہیں۔ ہاں اسی سلسلۂ سیادت رضوی یا نقوی سے ہیں جس سے میں ہوں، اس سے آگے بڑھے تو خیر اتنا سہی وہ بھی میری طرح سادات میں سے ہیں، مگر اس کے بعد وہ میرے کوئی نہیں ہیں کیونکہ میں سیّد، وہ شیخ، حالانکہ کسی نقطہ پر سید اور شیخ بھی مل جاتے ہوں گے، مگر وہ اتنی دور ہے کہ نگاہِ توجہ مبذول نہیں ہوتی۔ یگانہ اور بیگانہ کی تفریق اور اسی کے ماتحت جو اپنا ہے اس سے الفت اور جو پرایا ہے مغایرت قائم ہوگئی اور جتنا یہ خط دور ہوتا گیا بے تعلقی کا احساس بڑھتا گیا۔ اب عرب اور ایرانی ہندوستانی اور انگریز میں ہم کوئی علاقہ محسوس نہیں کرتے۔ تمام عالم ایسے اجزاء میں تقسیم ہو گیا جن میں باہم کوئی رشتہ نہیں، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ میں برسرِ اقتدار ہوں تو میرے قبیلہ والوں، رشتہ داروں، ہم قوموں کو زیادہ فائدے پہنچے اس لئے کہ اقتدار میرا ہے! اور وہ میرے عزیز ہیں، لیکن دوسرا کتنا ہی کیوں نہ پریشان حال ہو اسے اس لئے استحقاق نہیں کہ وہ مجھ سے اجنبی ہے، یہ قابلِ امداد ہے اس لئے کہ اپنا ہے، اور وہ قابلِ اعتنا نہیں اس لئے کہ پرایا ہے، یہ تفریق مٹ نہیں سکتی اس لئے کہ مرکزِ اتحاد آپ کی ذات ہے اور وہاں سے خطوط کھینچنے پر قریب و دور کا رشتہ ضروری ہے، اس لئے احساس مساوات پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

اسلام بھی چونکہ دین فطرت ہے، اس کی ذات کو جدا نہیں کرنا چاہتا مگر اس کا مطمح نظر نگاہ کو بلند کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی ذات سے آگے بڑھو، نگاہ اونچی کرو اور یہ سوچو کہ میرا پیدا کرنے والا کون ہے؟ پہلا خط خالق کی طرف جانا چاہیئے، اب جبکہ یہ خط خدا تک پہنچ گیا تو چونکہ وہ ذات لامحدود ہے اس لئے اس سے جو خطوط چلیں گے وہ کسی سمت، کسی نسل، کسی جہت اور مکان میں محدود نہیں ہوں گے بلکہ وہ تمام مخلوقات تک یکساں حیثیت کھینچیں گے۔ ان میں فرق نہیں ہوگا کہ یہ میرا عزیز ہے یا غیر، میرا ہم وطن ہے یا نہیں، اب اگر عزیز کے حقوق بھی ہوں گے تو اتنے کہ جتنے اس نے مقرر کردیئے، ہمسایہ کے حقوق بھی اتنے ہی جتنے کہ اس نے معیّن فرمادیئے۔ اولاد کے حقوق بھی اتنے جتنے اس کی طرف سے مقرر ہوگئے اور اس کے بعد بہت سے حقوق ایسے بھی ہوں گے جو تمام نوعِ انسانی میں مشترک ہیں۔ ہاں! اگر وہ ایک کا ہوتا، دوسرے کا نہ ہوتا تو اس کے ذریعہ سے جو رشتے قائم ہوتے وہ بھی محدود ہوتے جیسے بعض مذہبی جماعتوں نے اسے بھی محدود بنا رکھا تھا، ان کا قول تھا ”نحن ابناۤء اللّٰہ و احبّائہٗ“ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے لاڈلے ہیں۔

قرآن نے یہ مقولہ نقل کرکے پہلے تو طنزیہ انداز میں جو اب دیا ہے ”قل فلم یعذبّکم بذنوبکم“ (اے رسولؐ) ان سے کہو کہ پھر وہ تمہارے اعمال کی سزا کاہے کو دینے لگا“ اس سے ایک اصول قائم کردیا گیا کہ یہ سمجھ لینا کہ اللہ صرف ہمارا ہے، اصلاحِ نفس کے لئے سم قاتل ہے، جب یہ سمجھو گے کہ اللہ سے بحیثیت جماعت صرف ہمیں تقرب حاصل ہے تو نفس کے سدھارنے کی طرف توجہ مبذول نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو اس کے بالمقابل کیا تعلیم دی گئی؟ کیا یہ کہ تم کہو کہ اللہ ہمارا ہے۔ یہ اس وقت سکھایا جاتا جب اسلام حقیقت میں اس کی طرف کا نہ ہوتا جو سب کا ہے اس نے یہ نہیں سکھایا بلکہ یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ”ھو ربّنا و ربکم لنا اعمالنا لکم اعمالکم“ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال“ اسی لئے سورۂ ”الحمد“ میں جس کا پڑھنا نماز میں ضروری ہے اور کہہ دیا گیا کہ ”لا صلوۃ اِلّاَ بِفاتحۃ الکتاب“ نماز ہو ہی نہیں سکتی بغیر سورۂ الحمد کے“ اب چونکہ لازمی طور سے ہر مسلمان کو پانچ وقت نماز ضرور پڑھنا ہے۔ کم سے کم مقدار ہے جو سلطنت الٰہی کے باغی اور غیر باغی کے امتیاز کا ذریعہ ہے اور ہر نماز میں کم از کم دس بار سورۂ الحمد زبان پر جاری کرنا لازم ہے۔ اب جو چیز الحمد میں صراحت سے ذکر کردی گئی ہے وہ ایسی ہی ہوگی جس کے لئے خالق کو منظور ہے کہ وہ ہر مسلمان کے دماغ پر نقش ہوجائے، پہلی آیت بسم اللہ کے بعد یہ ہے کہ ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰالَمِیْن“ حمد اللہ کے لئے جو (میرا پروردگار، میرے خاندان، میری قوم، میرے ملک کا نہیں، گھر، گھرانا اور خاندان، ملک، قبیلہ کیسا کہ ایک عالم کا بھی پروردگار نہیں بلکہ) تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ اس وقت فرمایا جب کہ عرب میں ہر ایک فرد کی دنیا اس کے قبیلہ میں محدود تھی۔ اس وقت اسلام نگاہِ مسلم کو اتنا وسیع بنانا چاہتا تھا حالانکہ یہ اب سوچا جارہا ہے کہ مریخ میں، چاند میں اور دوسرے سیّارات میں آبادی ہے یا نہیں۔ یہ مریخ و قمر ہمارے ہی سورج کے سیّارے اور اسی نظام شمسی کا جزء ہیں اس کے بعد یہ پتہ چلا ہے کہ وہ جو ثوابت کہلاتے تھے، ان میں ہر ایک ایک آفتاب ہے اور ہر آفتاب کے متعلق کچھ سیّارے ہیں۔ ابھی تو نگاہِ تحقیق صرف سورج کے سیاروں تک متوجہ ہوسکی ہے۔ ابھی وہ منزل کہاں کہ دوسرے ثوابت کے سیارات پر غور کرسکیں جب کہ یہ سب بالکل پردۂ غیب میں تھا اور دنیا تمام عالم کو ربع مسکون میں منحصر سمجھتی تھی، اس وقت قرآن پتہ دے رہا تھا کہ عالم ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے عالم ہیں۔

اب فرض کیجئے کہ اور ستاروں میں آبادی کا حال کھل جائے بلکہ دوسرے نظاماتِ شمسی میں بھی مخلوق ثابت ہوجائے، جہاں جہاں تک بھی انکشافات ہوں گے، وہ اسی ”عالمین“ کے احاطہ کا جز، ہوں گے جس کے متعلق قرآن نے پہلے ہی کہہ دیا

"رَبّ الْعَالَمِین" معلوم ہوا کہ جہاں تک مخلوقِ خدا بستی ہے، وہ سب ایک اخوت کی سلک میں منسلک ہے اور ایک برادری کا جزو ہے۔ اس لئے کہ خدا ان سب کا پروردگار ہے۔ اب اس کے ذریعہ سے جو خط کھینچے اس میں کوئی تفریق نہیں ہوسکتی کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا، بلکہ ہمارا وہ خدا ہے اور اس کے سب بندے ہیں۔ اس مشترکہ رشتہ کا احساس حقوق انسانی کا سنگ بنیاد ہے جس کے لئے دنیا میں منشور نشر ہوتے ہیں، کانفرنسیں منعقد ہوتیں ہیں اور حقوق انسانی کی فہرستیں مرتب ہوتیں ہیں مگر حقوق انسانی کا یہ تصور بے بنیاد ہے جب تک اس نقطۂ مشترک کا تصور نہ موجود ہو جہاں سے حقوقِ انسانی قائم ہوتے ہیں۔

پیغمبرؐ اسلام کا عمل اور اسلامی تعلیم کے مرقعے جو سامنے آئے، وہ بتاتے رہے کہ دنیا میں حقوقِ انسانی کیا ہوتے ہیں، مکّہ کی اس پرآشوب زندگی میں جب رسولؐ ایک راستہ سے گذرتے تھے تو ایک عورت بام خانہ پر سے خس و خاشاک آپ کے سر مبارک پر پھینکتی تھی، مگر رسولؐ نے نہ راستہ بدلا، نہ بدلنے کا خیال کیا، دن یوہیں گذرتے رہے، چند دن ایسے ہوئے کہ رسولؐ اس راہ سے گذرے مگر خس و خاشاک نہ پھینکا گیا، حضرت نے اہل محلہ سے پوچھا کہ وہ عورت کہاں گئی جو یہ عمل کیا کرتی تھی؟ بتایا گیا کہ وہ بیمار ہے۔ کہا: مجھے اس کا مکان بتادو کہ میں اس کی عیادت کرلوں۔ نتیجہ نہ دیکھنا چاہئے کہ کیا ہوا، یہ دیکھئے کہ آپ جو اس کی مزاج پرسی کو جارہے ہیں۔ یہ اس وقت کون سا فرض ہے حق ایمانی ہے یا حق انسانی؟ حق ایمانی تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ وہ ابھی ایمان نہ لائی تھی ماننا پڑے گا کہ یہ جسے آپ ادا فرمارہے تھے حقِ انسانی تھا یعنی انسان کا انسان پر حق ہے کہ مصیبت پڑے تو اس کے ساتھ ہمدردی کرے، یہ نہیں کہ مصائب میں اضافہ کرے۔

مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد جب غزوات کا سلسلہ جاری تھا، اور حضرت فاتح کی حیثیت رکھتے تھے تو حاتم طائی کی لڑکی آتی ہے۔ حضرت کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنی عبا بچھا دیتے ہیں پاس کے بیٹھنے والے کہتے ہیں کہ وہ مشرکہ ہے۔ تو فرماتے ہیں: ہر قوم کا بزرگ مرتبہ آدمی ایسا شخص جو اپنی قوم میں بلند اخلاق کا مالک ہو، اکرام کا مستحق ہے۔ یہ کیا ہے؟ اسے حق انسانی ہی ماننا ہوگا۔

آپ نے فرمایا "اَکْرِمُوْا الضَّیف وَلَوْ کَانَ کَافِراً" مہمان کی خاطر کرو، اگرچہ وہ کافر ہو' یہ کون حق ہوا؟ حق انسانی ہی ہوسکتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی آخری وصیت میں کہا کہ رسولؐ برابر ہمسایوں کے متعلق ہدایت فرماتے رہے۔ اس حد تک کہ لوگ سمجھتے تھے، ہمسایہ کو میراث دلوادی جائے گی۔ ہمسایہ کے معنی کوئی قوم وملّت نہیں۔ یہ حق انسانی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ فرد کی ہمسایہ فرد ہوتی ہے اور قوم کی ہمسایہ قوم ہوتی ہے۔ مذہبی حیثیت سے دو درجے بہت معزز ہیں ایک اسلام اور ایک ایمان۔ بنص قرآن ایمان کا رتبہ اسلام سے بالاتر ہے۔

"**قالت الاعراب امنّا قل لم تؤمنوا ولٰکن قُوْلُوْا اسلمنا ولمایدخل الایمان فی قلوبکم**" صحرائی عرب آکر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے کہو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام آسان ہے، ایمان مشکل۔ اسلام پہلے ہوتا ہے، ایمان بعد کو۔ مسلم کے بارے میں حدیث ہے کہ "**المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ**" مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

مومن کے بارے میں یہ حدیث ہے کہ "**المؤمن من امن جارہ بوائقہ**" مومن وہ ہے کہ جس کا ہمسایہ اس کے خطروں سے مطمئن رہے، اس کے مفہوم پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ 'محفوظ رہے' اور 'مطمئن رہے' میں فرق ہے۔ 'محفوظ رہے' ایک واقع شدہ عمل کو ظاہر کرتا ہے اور مطمئن رہے ایک مستقل کردار کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی تمہارا کردار

ایسا ہو کہ غیر جب تم میں کسی کو دیکھے تو یہ کہے کہ یہ آدمی اچھے ہوتے ہیں، ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک آدمی بھی تم میں کا کسی اجنبی محلہ میں جا کر بسے تو وہ اہلِ محلہ اپنی جان و مال اور آبرو کے لئے خطرہ محسوس نہ کریں۔

یہ حقوق انسانی کے ادا کرنے کی تعلیم ہے جس کا اصلی سرچشمہ وہی احساس برادری ہے جو تمام افراد انسانی سے انسان کو منسلک کرتا ہے۔

اسی لئے پیغمبرؐ خدا کی وفات کے بعد جب دنیا نے زمین کے فتوحات کی طرف توجّہ کی تو آل محمدؐ نے دلوں کے فتوحات کو اہمیت دی۔ مسلمانوں سے کہا کہ کردار اپنا وہ بناؤ جس سے دنیا محسوس کرے کہ دین اسلام کے پیرو ایسے ہوتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آ کر ایک عیسائی دائرہ اسلام میں داخل ہوا، اور تعلیم اہلبیتؑ کا پیرو بن گیا۔ اس کی ماں اپنے مذہب قدیم عیسائی پر قائم تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کے جذبات میں جو نیا نیا دائرہ اسلام میں داخل ہوا، ہو وقتی طور پر تموّج ہوا کرتا ہے۔ فطرۃً جب وہ شخص گھر واپس جاتا تو یہ کوشش کرتا کہ اس کی ماں بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ ہمارے دور کے علمائے اسلام میں سے بھی شاید کوئی ہوتا تو اس کو یہی تعلیم کرتا کہ یہاں سے جانے کے بعد تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی ماں کو مسلمان بنانا، مگر یہاں جب وہ رخصت ہونے کے لئے امام کے پاس آیا اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے کچھ ہدایت چاہی، تو آپ نے فرمایا "اوصیک بامّک خیراً" میری ہدایت بس یہ ہے کہ اپنی ماں سے حسنِ سلوک کرتے رہنا، اب جو وہ اپنے گھر پہنچا تو جو خدمتیں اپنی ماں کی کبھی نہ کرتا تھا، اب کرنے لگا، یہاں تک کہ ماں کو تبدیلی محسوس ہوئی اور اس نے کہا: "بیٹا یہ کیا بات ہے کہ تم کچھ بدل سے گئے ہو۔ پہلے تو ایسا حسنِ سلوک تم نہ کرتے تھے" اس نے پہلے ٹالا، کہا: "یہ تو میرا فرض ہے۔" مگر جب وہ بہت بضد ہوئی تو اس نے مجبور ہو کر بتایا کہ میں نے دین اسلام قبول کر لیا ہے اور میرے امام نے یہ ہدایت کر دی ہے کہ اپنی ماں سے حسنِ سلوک کرنا۔ بس یہ سن کر اس نے کہا: "مجھے بھی اس امام کے پاس لے چلو کہ ایسی پاک تعلیم ان سے میں بھی حاصل کروں۔"

حضرت رسولؐ کے بعد عام فرزندان اسلام نے بھی یوں ہی اسلام پھیلایا ہوتا تو کبھی اندیشۂ ارتداد نہ ہو سکتا تھا۔

اسلام نے سکھایا تھا کہ دیکھو نصب العین یہ رکھو کہ اپنے کو جامعۂ انسانی کی اچھی فرد ثابت کرو۔ یاد رہے کہ افراد صالحہ سے جس نظام کی تشکیل ہوگی، وہی نظام عدل و صلاح کا ہو سکتا ہے۔

حقوقِ انسانی کے احساس کے ساتھ جب اقتدار ملے گا پھر یہ نہ دیکھیں گے کہ یہ ہمارے صوبہ کا ہے، ہمارے ملک کا ہے یا ہمارا ہم خیال ہے اور وہ غیر ہے۔ ہمارے سامنے وہ تعلیم ہے کہ جو علیؑ مرتضیٰ نے مالک اشتر کو دی ہے، جب انہیں مصر کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے حالانکہ وہ خود بھی بڑے فرض شناس تھے۔ مگر انھیں بھی علیؑ بن ابی طالبؑ مطلق العنان طور پر نہیں چھوڑتے بلکہ ایک ہدایت نامہ سپرد کرتے ہیں۔

یہ ایک طویل فرمان ہے جس کے بارے میں عرب کے عیسائی مورّخ عبدالمسیح انطاکی نے لکھا ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھ کر تمام سلاطین اسے اپنے سامنے رکھیں۔

اس فرمان میں حضرت علیؑ تحریر فرماتے ہیں کہ میں تم کو ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں مختلف مذاہب کے افراد ہیں، تم کو لازم ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک رکھنا۔ یاد رہے کہ یہ کسی سیاستِ وقت کی پیداوار نہیں ہے، یہ وہ فرمان ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے لکھا گیا ہے، اور آج سے ایک ہزار سال پہلے کتاب میں درج ہو گیا، اور آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مصر و بیروت میں طبع ہوا اور اس مدّت میں مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوا، اس میں اس سوال کا جواب موجود ہے جو اس وقت ہر ملک کی اقلیت کے سامنے ہے۔

وہاں کی بااقتدار اکثریتوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ "تمہاری وفاداری پر بھروسہ کس طرح کیا جائے؟"

اس کا جواب حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے دیا ہے ان الفاظ میں "**ولٰکن حسن ثقتک بھم بمقدار حسن صنیعک الیھم**" تمہارا بھروسا اپنی رعایا کی وفاداری پر اتنا ہونا چاہئے جتنا تمہارا سلوک ان سے بہتر ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے نہ پوچھو تم وفادار ہو گے یا نہیں؟' بلکہ خود اپنے سے پوچھو کہ تم سلوک کیسا رکھو گے، اگر سلوک اچھا رکھا تو آج کے غیر وفادار بھی کل وفادار ہو جائیں گے اور اگر سلوک اچھا نہ ہوا تو اس سوال کے جواب میں جو وفاداری کے وعدے ہوں وہ بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

یادِ الٰہی اور احساسِ فرائض

خدا کی یاد جس پر اسلام نے زور دیا ہے، اس یاد سے مختلف ہے جو دوسرے مذاہب میں ہے، مثلاً ہفتہ میں کوئی ایک دن مقرر کر کے اسے یاد کر لینا، دن میں کوئی ایک وقت مقرر کر کے یاد کر لینا۔ دوسرے مذاہب میں کاروبارِ دنیا سے یہ الگ ایک مشغلہ ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ یادِ الٰہی ہر مذہب کی بنیاد ہے، مذہب ایک شعبۂ حیات بن گیا۔ ایک چیز ہے پیشہ، ایک ہے خاندان، اسی طرح ایک چیز ہے اس کا مذہب جس کا اثر نمودار ہوتا ہے چند رسموں میں خاص خاص اوقات میں۔

عیسائی ہفتہ میں ایک دن گرجا جا کر عبادت کرتا ہے، اس دن اس کی عیسائیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، باقی چھ دن وہ ڈاکٹر ہے، وکیل ہے، بیرسٹر ہے، کوئی بھی ہے اس میں عیسائیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مگر اسلام میں مذہب کا تصوّر اس سے مختلف ہے۔ دوسرے مذاہب میں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور اسلام میں یاد رکھا جاتا ہے، تمام دوسرے نظام مذاہب میں مذہب جزو زندگی ہے اور اسلام میں مذہب کلِّ زندگی ہے۔ جزو زندگی تو اس وقت ہوتا جب کاروبارِ دنیا سے الگ کوئی چیز ہوتا۔ دماغ میں چند خیالات جمع ہوں اور کچھ لفظیں زبان پر جاری کر لیں۔ یہ ہوتا اسلام تو دنیا کی باقی چیزوں سے الگ زندگی کا ایک شعبہ سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے یہ اسی تخیل کی بناء پر ہے جو دوسرے مذاہب میں ہے۔ اسلام میں مذہب کوئی خاص شعبہ نہیں ہے بلکہ وہ انفرادی اجتماعی، اخلاقی، معاشرتی ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

اگر مذہب وہ ہوتا کہ کچھ تقلیدی خیالات محفوظ کر لئے تو ممکن تھا کہ کوئی شخص مذہب کے اعتبار سے مسلم ہو اور معاشیات میں کارل مارکس کا پیرو ہو، سیاسی زندگی میں کسی اور رہبر کا مطلق طور پر مقلد ہو، اپنے گھر بار کے معاملات میں صرف رواج کا پابند ہو۔ یہ صورت وہاں ممکن ہے جہاں مذہب تمام زندگی سے الگ تھلگ کوئی چیز ہے، مگر اسلام نام ہے انفرادی اور اجتماعی و تمدنی ہر شعبہ میں ان تعلیمات کو قبول کرنے کا جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کی زبان سے دنیا کو پہنچے ہیں۔

اس صورت میں اگر کسی نے کہا "**اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمدالرسول اللہ**" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اخلاقی زندگی کو بھی تعلیمات محمدیؐ کا پیرو بنا لیا۔ اجتماعی اور اقتصادی حیات کو بھی تابع فرمان محمدیؐ و قانون اسلام بنا لیا۔

اب جس طرح کوئی کہے کہ میں مسلمان عیسائی ہوں تو یہ صحیح نہ ہوگا بلکہ مسلمان ہے تو عیسائی نہیں، اور عیسائی ہے تو مسلمان نہیں، کوئی کہے کہ میں ہندوستان پاکستانی ہوں تو صحیح نہیں۔ جب دونوں ملک الگ الگ ہو گئے تو جو یہاں کا ملکی ہے وہاں کا نہ ہوگا اور جو وہاں کا ملکی ہے وہ یہاں کا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مسلمان ہونے کے ساتھ اپنے کو کسی دوسرے نظام کے ساتھ وابستہ کرنا، خواہ سیاست میں ہو، خواہ معاشیات میں، خواہ کسی اور شعبہ میں، درست نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام نے کوئی شعبہ تشنۂ تعلیم چھوڑا ہوتا، تو ایسا ہو سکتا تھا، مگر جب اسلامی تعلیم تمام نظامِ حیات پر حاوی ہے جس میں معاشیات اور غیر معاشیات سب داخل ہیں۔ تو اب مسلم ہوتے ہوئے کسی شخص کو اپنی زندگی کے بٹوارے کا حق نہیں باقی ہے۔

وہ عیسائیت تھی جہاں یہ ہو سکتا تھا کہ ایک شخص ہفتہ میں

ایک دن عیسائی ہے اور چھ دن ڈاکٹر، تاجر، وکیل یا کچھ اور ہے۔ اسلام کسی شعبہ کو نہیں چھوڑتا۔ یہاں تو ڈاکٹر ہے تو اسے مسلم ڈاکٹر ہونا چاہئے، تاجر ہے تو اسے مسلم تاجر ہونا چاہئے۔ مسلم یعنی فرائض انسانی کے احساس اور قانون الٰہی کا احترام کرنے والا۔ مریض آتا ہے، یہ اس کا علاج کرتا ہے، یہ معالجہ ڈاکٹر ہونے کا تقاضہ ہے، لیکن ایک مریض اگر ایسا آیا جس کے متعلق یہ سمجھنا ہے کہ اس کی زندگی میرے علاج پر موقوف ہے تو اب مسلم ہونے کا امتحان ہے، اب اگر اس کے علاج کے لئے منہ مانگی فیس لینا چاہتا ہے اور اس کی اس نازک حالت کو اپنے لئے زیادہ تحصیل زر کا ذریعہ قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ڈاکٹر تو ہے مگر عملاً مسلم نہیں ہے، اگر مسلم ہے تو اس کو یہ فریضہ یاد رکھنا چاہئے کہ حفظ نفس محترمہ اس پر واجب ہے۔ اسی طرح اگر تاجر ہے اور بس نفع اندوزی سے کام ہے، بڑی بڑی کوٹھیاں کھڑی ہوں، زیادہ سے زیادہ کارخانے قائم ہوں، کثیر سے کثیر رقم تجوریوں کے اندر، یا بینک میں محفوظ ہو لیکن حقوق الناس کا کوئی خیال نہیں ہے، زکوٰۃ اور خمس سے کوئی مطلب نہیں، تو یہ بس تاجر ہے، عملی حیثیت سے مسلم نہیں ہے۔ اگر مسلم ہے تو اسے یہ لحاظ رکھنا ہوگا کہ کسی کا حق میرے ذمہ نہ رہے، خلق خدا کی بہبودی پیش نظر رہنا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور وہ غلہ جمع کر رکھے کہ جب مہنگا ہو تو فروخت کریں گے۔ اگر ان حقوق فرائض کے لحاظ کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہے تو اسلام میں یہ تجارت بھی عبادت ہے، سوا ان تجارتوں اور پیشوں کے جو بنیادی حیثیت سے ہو (ہی) خلاف شرع ہیں۔ ان کو تو اختیار کرنا خود دلیل ہوگا کہ اسے تعلیمات اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اسلام نے اپنی شریعت کے حکیمانہ تعلیمات سے اس کا انتظام کیا کہ یاد الٰہی تحت الشعوری طبقات نفس میں راسخ ہوجائے۔

مثال کے طور پر یہ ہے کہ ہمارا اچھا کھانا اللہ کو ناپسند نہیں ہے "**احل لکم الطیبات**" "تمہارے لئے لذیذ و پاکیزہ غذائیں سب ہلال ہیں" جو غذائیں حلال ہیں، ان میں ذائقہ کی کمی نہیں، یہ اور بات ہے کہ کسی کو حرام غذا ہی میں مزہ ملتا ہو۔ پھر بھی حلال و حرام کی تفریق رکھ دی۔

جانور وہ نہ ہو جو حرام ہے، ذبیحہ ہو، میتہ نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان شکم پرست نہ ہوجائے بلکہ شکم پروری کے ساتھ ساتھ خدا پرست رہے۔

اب جس وقت کوئی مشتبہ غذا سامنے آئی، شک پیدا ہوا اور یہ سوال پیدا ہوا کہ ذبیحہ کا گوشت ہے یا نہیں؟ معلوم ہوگیا کہ انسان مادّی ضروریات کے خاطر خدا کو نہیں بھولا، خصوصاً جنہیں شکار کا ذوق وشوق ہے، شکار کو گئے جانور کا تعاقب کیا، کس جدو جہد سے شکار دستیاب ہوا، ظاہر ہے کہ یہ تگ ودَو مادیت کی راہ میں ہورہی ہے، بظاہر دور دور خدا کا تصور نہیں ہے مگر جب شکار کو نشانہ بنایا، گولی لگائی اور جا کر دیکھا تو وہ سرد ہوگیا تھا۔ زبان سے نکلا کہ ارے یہ تو بیکار ہوگیا، پس معلوم ہوگیا کہ اس تگ ودو میں بندہ خدا کو نہیں بھولا تھا۔

اسی طرح اچھے لباس کا پہننا شریعت میں ناجائز نہیں ہے۔ وہ اور مذاہب ہوں گے جنھوں نے لٹا پٹا یا برہنہ ہونا کمال روحانیت کا معیار بنایا ہوگا۔ اسلام میں تو بغیر لباس نماز جائز نہیں ہے چاہے تاریکئ شب میں پردے ڈال کر خالی مکان میں بھی ہو۔ یہ لباس مرد کے لئے تو خیر مختصر ہے، مگر عورتوں کے لئے نماز میں سوائے چہرہ اور ہاتھ کے کل اعضاء کا چھپانا لازم ہے، تنہائی میں پردے ڈال کر بھی، بغیر پورے لباس کے عورت کی نماز نہ ہوگی۔

پھر بھی مردوں کے لباس میں کچھ پابندیاں رکھ دیں کہ لباس خالص ریشم کا نہ ہو سونے کے زیور سے آرائش نہ ہو وغیرہ وغیرہ، اس طرح لباس میں بھی فرائض کا احساس قائم ہے۔ اب فرض کیجئے کہ بزاز کی دوکان پر گئے، اچھے سے اچھے کپڑے منتخب کر رہے ہیں۔ خریداری پر آمادہ بھی ہوچکے ہیں مگر ادھر ایک کپڑے میں شک ہوا اور پوچھا یہ ریشم تو نہیں ہے، ادھر ظاہر ہوگیا

کہ بندہ اپنے خدا کو نہیں بھولا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خالص مادی خواہشیں جن میں بہت کم انسان اور حیوان میں فرق باقی رہتا ہے ان میں بھی جب حیات نفس طوفانی ہوں، طرفین کی رضا ہو، تمام مقتضیات موجود ہوں اور تمام موانع مفقود ہوں، کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو اور کسی مخبر کا اندیشہ نہ ہو، اس وقت بھی ایک مسلم کو تصور ہو گیا کہ جب تک ایجاب و قبول کے صیغے جاری نہ ہوں، اس وقت تک یہ عورت حرام ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جذبات کے انتہائی تلاطم میں بھی بندہ اللہ کو نہیں بھولا ہے۔ یہی راز ہے ایجاب و قبول کے صیغوں میں ورنہ یہ کوئی منتر نہیں ہیں، جن کی طبعی خاصیتیں ہوتی ہوں۔ یہ فرض شناسی کا نشان ہے جو جائز اور ناجائز تعلقات میں امتیاز قائم کرتا ہے۔

روحانیت اور مادّیت کے تعلقات

اسلام میں رہبانیت حرام ہے۔ دوسرے مذاہب کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد اس وقت ہو گی جب غار، پہاڑ یا جنگل میں چلے جاؤ۔ اسلام کہتا ہے ''لا رھبانیۃ فی الاسلام'' یہاں ترک تعلقات دنیا نہیں ہے۔

''**لیس منا من ترک الدّین لدنیاہ ولا من ترک الدنیا لدینہ**'' ہم سے اسے کوئی تعلق نہیں کہ دنیا کو آخرت کے لئے یا آخرت کو دنیا کے لئے چھوڑ دے۔

عام طور پر شاید یہ سمجھا جا سکے کہ وہ معیار روحانیت اونچا تھا کہ نہ شادی کرو، نہ تعلقات کرو، نہ کوئی آس پاس ہو، نہ ہمسایہ ہو حالانکہ وہ معیار ناقص تھا۔ کامل وہی ہے جس کی تعلیم حضرت محمد مصطفیٰؐ لے کر آئے۔ اب یہ سمجھنا کہ یہ معیار سب سے اونچا کیوں کر ہے۔ اس مثال سے شاید آسان ہو کہ ایک ایسا طالب علم ہے جس کی طبیعت سبق میں نہیں لگتی، اچاٹ طبیعت ہے مگر سال پورا ہونے کے قریب ہے، امتحان سر پر آ گیا ہے۔ اب اگر گھر میں کتاب دیکھتا ہے تو ادھر کتاب دیکھنا شروع کی، ادھر کوئی بات کرنے لگا دل ادھر متوجہ ہو گیا، کوئی بچہ رونے لگا، کتاب غائب ہو گئی، کوئی قصہ کہیں کا بیان ہونے لگا اسی کے سننے میں مصروف۔ اب امتحان کی تیاری کے لئے مجبوراً کوئی تہہ خانہ ڈھونڈھنا پڑے گا، کوئی خالی عمارت یا دریا کا کنارہ تلاش کرنا پڑے گا یعنی کوئی ایسی جگہ جہاں کوئی آنے جانے والا نہ ہو۔ جب کوئی منظر سامنے نہ ہو گا، اور کوئی دوسری آواز کان میں نہ آئے گی، تب یہ کتاب دیکھ سکے گا۔ مگر جو محنتی طالب علم ہے اور ذوقِ علم رکھتا ہے وہ جب کتاب کے دیکھنے میں مصروف ہوتا ہے تو کتاب ہی کا ہو رہتا ہے، گھر میں شور ہوتا رہے بات چیت جاری رہے، غل ہوا کرے، وہ تو کتاب دیکھ رہا ہے، اسے ضرورت نہیں پہاڑ اور غار تلاش کرنے کی۔

دنیا نے جو معیار یادِ الٰہی کا قرار دیا وہ اس اچاٹ طبیعت والے طالب علم کا معیار تھا، ان کے نزدیک گھر میں رہ کر یادِ الٰہی نہ ہو سکتی تھی جب جنگل اور پہاڑ پر گئے جہاں بچے نہ بیوی نہ عزیز نہ آشنا، جنگل ہے، سنسان ہو کا میدان، تو اب اللہ نہ یاد آئے گا تو کون یاد آئے گا۔

اسلام یادِ الٰہی کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ کثرت میں بیٹھو اور وحدت کا جلوہ دیکھو، نقار خانۂ عالم میں رہو، مگر دماغ میں آوازِ توحید گونجتی رہے، اس منظر رنگ و بو میں قیام کرو مگر وحدت کے جلوے نظر میں ایسے سمائے ہوں کہ اللہ کو بھولو نہیں۔

یہ معیار مشکل تر تھا، اسی لئے وہ رسولؐ جو اس کا حامل بنا کر بھیجا گیا تمام انبیاء سے افضل قرار دیا گیا۔ کیونکہ سابق انبیاء نے بھی اس تعلیم کو پیش کیا تھا، مگر ہمارے پیغمبرؐ نے مکمل طور پر پیش کیا، اور خود اپنا معیار زندگی بھی آپ نے اسی تعلیم کے مطابق رکھا۔

اگر آپ شادی نہ کرتے، اولاد نہ ہوتی تو خلائق پر اتمام حجّت نہ ہوتا۔ دنیا کہتی کہ ہم سے یہ مطالبہ کہ شادی کرو اور عبادت بھی، مگر آپ کے تو نہ بیوی ہے نہ بچے، آپ کیا جانیں کہ بچہ جب ضد کرتا ہے تو کتنی مشکل ہوتی ہے؟ بیوی جب بضد ہوتی ہے تو آدمی کو کس کشمکش کا سامنا ہوتا ہے؟ پھر اگر بیوی فقط جناب خدیجۂ کبریٰ ہوتیں تو افرادِ امت خیال کرتے کہ آپ کو کیا معلوم کیسی

کیسی بیویاں ہوتی ہیں؟ آپ کو اتفاق سے ایک نیک بی بی ملی۔ ہمیں کیسے کیسے سابقے پڑتے ہیں، حضور کیا جانیں؟ ہم کہاں فرائض کا لحاظ کر سکتے ہیں، یہ حجت بھی ختم کر دی، ہر قبیلہ کی، ہر خاندان کی، ہر مزاج کی عورت سے شادی کی، ''اب دیکھو'' عدل میں کوئی کمی تو نہیں ہے۔

دنیا سیرتِ رسولؐ کی بلندی دیکھے، ہزاروں غلط روائتیں گڑھ لی گئیں، کتنی ہی غیر شایان رسالت حکایتیں ایجاد ہوئیں، پھر بھی اتنی بیویوں کے باوجود ایک بیوی سے بھی غلط روایت تک نہ آئی کہ میرے ساتھ رسولؐ ناانصافی کرتے تھے۔

غیر مسلم کہتے ہیں کہ رسولؐ نے بیویوں کی تعداد دوسروں سے زیادہ کیوں رکھی۔ جواب یہ ہے کہ ہر فریضہ میں پیغمبرؐ نے حصہ اپنا زیادہ رکھا تھا۔ سب کے لئے واجب صرف پانچ نمازیں ہیں اور رسولؐ کے لئے ان کے علاوہ نمازِ شب پڑھنا بھی فرض تھا، اسی طرح ہر منزل میں خود عمل زیادہ کیا، دوسروں کے ذمہ کم رکھا۔

اب دیکھئے کہ نکاح اسلام میں دو قسم کے ہیں:

ایک نکاح دائمی، اور دوسرے نکاح عارضی جسے متعہ کہتے ہیں۔

نکاح دائمی میں فطری خواہشوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے، اور فرائض کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، نان ونفقہ لازم ہے۔ چند بیویاں ہیں تو ان میں عدالت ضروری ہے مگر نکاح عارضی فطری خواہشوں کی تکمیل کا حدود شرع کے اندر سامان ہے لیکن فرائض سخت نہیں۔ ذمہ داریاں وہ نہیں جو نکاح دائمی میں ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لئے تعداد جو مقرر ہے وہ نکاح دائمی میں ہے، نکاح عارضی میں نہیں ہے۔ اب جبکہ عوام کو متعہ کے واسطے کسی تعداد کا پابند نہیں کیا گیا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسولؐ نے لذت اندوزی میں اپنا حصہ زیادہ رکھا۔ ہاں نکاح دائمی میں جہاں ذمہ داریاں ہیں اور فرائض کی شدت ہے، وہاں دوسروں کے لئے تعداد کم رکھی اور رسولؐ کا حصہ زیادہ ہے۔ آپ نے ذمہ داریوں کا شکنجہ اپنے لئے سخت تر رکھا، پھر بھی ثابت کر دیا کہ دیکھو نہ فرائض تشنۂ تکمیل رہتے ہیں، نہ عبادت الٰہی میں کمی ہوتی ہے۔

اس طرح آپ نے اس نظام کے تقاضوں کو بحد کمال پورا کر کے دکھایا، جو کہتا ہے کہ کمال روحانیت یہ ہے کہ مادّی علائق میں گرفتار ہو کر فرائض میں انہماک قائم رکھو۔ وہ دوسرے مذاہب ہیں جو کہتے ہیں کہ جب تک یہ تعلقات دنیا چھوڑے نہ جائیں، روحانیت ناقص رہتی ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ ان تعلقات کے رکھتے ہوئے ادائے فرض میں جد و جہد ہی سے روحانیت میں بلندی ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے غیر شادی شدہ کی نماز سے شادی شدہ کی نماز افضل قرار دی گئی ہے، اس لئے کہ جب تک شادی نہ ہو، نماز اس جہادِ نفس کی حامل نہیں ہے جو شادی ہونے کے بعد نماز میں ہو سکتا ہے۔

اس نظام کی مخصوص امتیازی شان اس واقعہ میں بھی نمایاں ہوئی کہ جب نصارائے نجران کو مباہلہ کی دعوت دی گئی، قرآن نے کہا:

''قل تعالوا ندع ابنآء نا و ابنآئکم و نسآء نا و نسآء کم و انفسنا و انفسا کم ثم نبتھل فنجعل لعنة اللہ علی الکاذبین۔''

اے رسولؐ ان سے کہو کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلائیں، تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلائیں، تم اپنے نفسوں کو بلاؤ پھر باہم مباہلہ کریں، اور اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر'' ایک یہ روحانی مقابلہ تھا اور اس میں عورتوں اور بچوں کے لانے کی دعوت دینا نظام عیسائیت پر ایک ضرب تھی کہ تم تو ان چیزوں کو روحانیت میں سدّ راہ سمجھتے ہو مگر یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے نزدیک سفرِ روحانیت میں رفیق راہ ہیں۔

سامانِ بقاء یا معیارِ فنا

مذہب وہ بقاء و دوام کے لائق ہو سکتا ہے جو انسان کو باقی رکھنے کے ساتھ ارتقاء کے راستے بتائے، ایسی مذہبی تعلیم جس پر اگر سب عمل پیرا ہو جائیں تو صفحۂ عالم انسان کے وجود سے خالی

ہوجائے، یا تو یہ تعلیم کبھی تھی ہی نہیں بلکہ وہ بعد کی ساختہ و پرداختہ ہے اور یا تھی مگر کسی عبوری دور کے لئے وقتی مصالح کی بنا پر تھی، دائمی نہ تھی۔

جیسے یہ تعلیم کہ اللہ کی بادشاہت میں وہ داخل نہیں ہوسکتا، جو شادی کرلے، اگر ہر شخص اس تعلیم پر عمل کرنے لگے تو دنیا وجود انسانی سے خالی ہوجائے۔

دنیا باقی تو اس لئے ہے کہ اس تعلیم کو اس نے قبول ہی نہ کیا اور جنھوں نے قبول کیا ان میں کے ہر دور کے چند اشخاص ہی نے اس پر عمل کیا، وہ بھی کچھ نے واقعی اور کچھ نے نمائشی طور پر اپنے کو معبودوں پر چڑھا دیا، یا خدمت خلق کے لئے وقف کردیا۔

حالانکہ تعلیم کا منشاء یہ نہیں ہوتا کہ دو چار عمل کریں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ سب عمل پیرا ہوں۔ اب اگر تمام نوعِ انسانی اس پر عمل کرنے لگے تو ایک صدی کے اندر عالم وجود انسان سے خالی ہوجائے، پھر پتھر، درخت، جانور سب ہوں گے مگر نوع انسانی کا وجود نہ ہوگا، ناقص اقسام رہ جائیں گے اور کامل نوع فنا ہوجائے گی۔ یہ تعلیم دوامی کیسے ہوسکتی ہے۔

اسی طرح یہ تعلیم کہ خدا نہیں مل سکتا جب تک پہاڑوں، غاروں اور جنگلوں میں نہ چلے جاؤ۔ اب ظاہر ہے کہ خدا تک رسائی ہر بندے کا فریضہ ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ چند سادھوؤں نے اس پر عمل کرلیا کہ وہ جنگل میں رہنے لگے، تعلیم کا منشاء تو یہی ہوتا ہے کہ ہر فرد اس پر عمل پیرا ہو۔ اب اگر سب کو شوق ہوجائے اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا اور ہر بندہ چاہے کہ وہ اللہ تک پہنچ سکے، تو تجارت، زراعت، صنعت وحرفت جو تمدن کی علامتیں ہیں سب ختم ہوجائیں، ارتقا کے قدم جتنے اب تک اٹھائے جاچکے ہیں، وہ سب واپس پلٹ جائیں۔ گھر برباد ہوں اور جنگل آباد ہوجائیں، تمام روئے زمین خالی ہوجائے اور شکم زمین پُر ہوجائے۔ کچھ غاروں میں، کچھ پہاڑوں میں اور کچھ جنگلوں میں لیکن شہروں میں ایک بھی نہیں، اس صورت میں تعلقات ازدواجی کیسے اور نظامِ منزلی کا کیا سوال؟ نتیجہ اس کا بھی وہی ہوگا کہ صفحۂ وجود انسان کے نقش سے خالی ہوجائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ من حیث الجماعت کوئی قوم، ملک یا نسل ایسی ہو ہی نہیں سکتی جو اس تعلیم کو اختیار کرسکے۔ ایسی تعلیم نوعِ انسان کو پیغام بقا نہیں، پیغام فنا دیتی ہے۔ اسی بناء پر ہم یقین کے ساتھ اپنے اس قول کو دہراتے ہیں کہ یہ تعلیم یا تو رہنمایان دین کی طرف غلط منسوب کردی گئی ہے اور یا وہ کبھی وقتی حالات کی بنا پر عارضی طور سے کسی عبوری دور کے لئے پیش کی گئی تھی، اس میں بقا کی صلاحیت نہ تھی، بقاء ودوام کا استحقاق رکھنے والی وہ تعلیم ہوگی جو نوع انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا حق دیتی ہوں، خودکشی کو جرم قرار دیتی ہو، ہر آدمی پر اس کے جسم کے حقوق قرار دے رہی ہو، ہم جنس افراد کے حقوق عائد کررہی ہو، جب کہ دوسرے بعض مذاہب یہ سکھا رہے ہیں کہ جتنی مشقت اٹھاؤ، اللہ راضی ہوگا، اس لئے عبادت کا ایک طریقہ یہ ہوگیا کہ میخدار تختہ پر اپنے جسم کو رکھ دو تا کہ میخیں چبھتی رہیں اور جسم کو ایذا ہو، اس طرح اللہ خوش ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ہاتھ کو خشک کرلو، دیگر اعضاء کو بیکار بناؤ۔ اس طرح جسمانیت میں کمی ہوگی تو روحانیت میں ترقی ہوگی۔ اس تخیل کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ جسم اور روح کو متضاد قرار دیتے ہیں۔ متضاد چیزوں میں ایک کی کمی سے دوسرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاتھ خشک ہوا روح بڑھ گئی۔ جسمانی طور پر کسی کام کے نہ رہے تو روحانی طور پر کارآمد بن گئے۔ مگر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم اور روح کے تضاد کو دور کرتا ہے، وہ تو اسی جسم کو خادم روح قرار دے کر اس کے افعال واعمال کو روحانیت کے ارتقاء کا ذریعہ بناتا ہے، اس لئے وہ جسم کے معطّل اور بیکار بنانے کا حامی نہیں ہے۔ یہاں تو جو قانونی فریضہ ضررِ جسمانی کا باعث ہو، وہ فریضہ تک برطرف ہوجائے گا، مثلاً وضو نماز کے لئے لازم ہے لیکن اگر ضرر کا اندیشہ ہو تو وضو نہیں تیمم کیا جائے، خواہ مرض کے پیدا ہونے کا خوف ہو، خواہ مرضِ موجود کے بڑھنے کا ڈر، خواہ اس کے مشکل العلاج ہونے کا اندیشہ ہو۔ ہر صورت میں وضو کا حکم

تیمم سے بدل جائے گا۔

روزہ کا حکم ہے اور وہ فریضہ ہے لیکن اگر مضر ہے وہی اقسام ضرر جو وضو میں بیان ہوئے روزہ پر مرتّب ہیں تو حکم روزہ برطرف ہونے کے بعد کسی اور زمانہ میں ان روزوں کی قضا کرے۔

راہ پرامن نہ ہو تو فریضۂ حج ساقط۔ ہاں جب نوعِ انسانی کے بنیادی مقاصد وجود کا تحفظ جان دینے پر موقوف ہو، تب قربانی کا فریضہ عائد کیا۔ وہ افراد انسانی کو جان دینے کی دعوت بھی نوع انسان ہی کی بہبودی کے خاطر ہے۔ اسی طرح دین کے ساتھ دنیا کی حقیقی تعمیر کا بھی انتظام کیا اور انسانیت کے ارتقاء کے صحیح راستے بھی معیّن کئے۔

معیار فضیلت

دنیا والوں نے نوعِ انسان میں مادی حقیقتوں سے بڑے اور چھوٹے کے امتیاز قائم کئے۔ جس کے پاس دولت زیادہ وہ بڑا، جو اونچے خاندان میں پیدا ہو، بڑا وہ جس کے بڑے آدمیوں سے روابط قائم ہو گئے وہ بڑا، یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو انسان کے صفات سے تعلق نہیں رکھتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاح عمل کا جذبہ ختم ہو گیا، اس لئے کہ دو چیزیں قوتِ عمل کو سلب کرتی ہیں: اعتماد کامل اور مایوسی کامل۔ ایک لڑکے کو امتحان دینا ہے۔ اپنے تعلقات کی بنا پر اسے یقین ہے کہ میں کامیاب ہوں گا۔ اب وہ کیوں محنت کرے؟ کیوں سر کھپائے؟ کیوں رات رات بھر کتاب دیکھے؟ جب یقین ہے کہ میں بہرحال اول نمبر پاس ہوں گا تو قوت عمل ختم ہو گئی۔ دوسری طرف جب مایوسی ہو کہ میں جو بھی کروں فیل ہوں گا۔ ناکامیابی کا جب یقین ہو گیا تو بھی محنت نہ کرے گا۔ سمجھے گا کہ میں جو بھی کروں کامیاب نہ ہوں گا، تو پھر زحمت اٹھانا بے کار ہے۔

اسی طرح نوع انسانی میں جب اونچے اور نیچے درجے مستقل طور پر ہو گئے تو جو اونچے اور بڑے خاندان میں پیدا ہوا وہ سمجھے گا کہ میں بہرحال اونچا ہوں اب وہ اصلاح نفس کیوں کرے؟ ضبط نفس کیوں کرے؟ اپنے میں بلند خصال پیدا کرنے کی کیوں کوشش کرے؟ وہ تو سمجھتا ہے کہ بلندی میرے قدموں سے لپٹی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف جو نیچی ذات میں پیدا ہوا وہ سمجھتا ہے چاہے جو کروں میں نیچا ہی رہوں گا، پھر جدوجہد کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔

اسلام نے معیار بلندی ایسا مقرر کیا جو ہر ایک کے ارادی افعال اور اعمال سے متعلق ہے۔

ارشاد ہوا: "**اِنَّا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعو با و قبائل لتعار فوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔**"

ترجمہ: "ہم نے اصل میں تم لوگوں کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں جو تقسیم کیا ہے وہ صرف پہچان کے لئے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ نسبی حیثیت سے اگر صرف خاندان ہی کو تم معیار اخوت و مساوات قرار دیتے ہو تب بھی تم سب ایک مورث کی نسل سے ہو، لہٰذا سب بھائی بھائی ہوئے، اسی لئے اکثر جب پکارا ہے تو "**یابنی آدم**" کہہ کر پکارا تاکہ مشترک مورث اعلیٰ کی یاد سے احساس اخوت زندہ ہو۔ بیشک مختلف قبیلے اور خاندان اس کے بعد ہو گئے تاکہ پہچان میں آسانی ہو، مثلاً ایک نام کے آدمی دو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ اس کا خاندان لکھ دیا جائے تو شناخت میں آسانی ہو گی، مگر یہ بلندی کا معیار نہیں، بلندی کا معیار یہ ہے "**اِنَّ اکرَمَکم عنداللہ اتقاکم**" تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، اس میں یہ قید نہیں کہ کسی زمانۂ خاص مثلاً زمانۂ رسولؐ میں ہوتا کہ آج کے مسلمان سمجھیں کہ ہم تو اس منزل کو حاصل ہی نہیں کر سکتے اس لئے کہ ہم اس دور میں پیدا ہی نہیں ہوئے، نہ یہ قید ہے کہ خاص سرزمین کا آدمی ہو تاکہ دور افتادہ ممالک کے لوگ سمجھیں کہ ہم کیا کریں ہم اس منزل کو حاصل نہیں کر سکتے۔

تقویٰ تو ذاتی وصف ہے۔ اگر وہ وصف بعد والے آدمی

میں زیادہ ہے اور رسولؐ کے زمانہ والے میں کم تو بعد والا زیادہ معزز ہوگا نظر الٰہی میں بہ نسبت اس شخص کے جو اس وقت موجود تھا۔ اسی طرح اگر کوئی سرزمین مکہ میں ہے مگر تقویٰ کی منزل میں پیچھے ہے اور کوئی ہندوستان میں ہے اور تقویٰ کی منزل میں آگے ہے تو خدا کی نظر میں یہ اکرم ہوگا۔

ہاں ایک ہوتا ہے شرف اور دوسری چیز ہے فضیلت۔ شرف غیر اختیاری امتیازات سے بھی حاصل ہوتا ہے، مگر اس سے فضیلت کا تعلق نہ ہوگا، مثلاً مکہ کی خاک کا ایک ذرّہ جو شرف رکھتا ہے وہ یہاں کا انسان نہیں رکھتا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جماد انسان سے افضل ہوگیا۔ جماد پھر بھی جماد ہے اور انسان پھر انسان ہے۔

حجر اسود جس کا بوسہ ہر مسلمان لیتا ہے شرف کے لحاظ سے جو مرتبہ رکھتا ہے وہ بڑے سے بڑا صاحب اوصاف دور افتادہ انسان نہیں رکھتا۔ وہ، وہ ہے جس کا معصومینؑ تک بوسہ لیتے تھے۔ یہ منزل کہ جو پتھر کو حاصل ہوئی اس سے عموماً انسان محروم ہے مگر پتھر پھر بھی پتھر ہے اور آدمی پھر بھی آدمی ہے، یہ نہیں کہ جماد انسان سے افضل ہوگیا۔

اسی طرح پیغمبرؐ کی صورت دیکھنا بڑا شرف ہے۔ کسی راستہ چلتے کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہ کچھ دور رسولؐ کا رفیق راہ تھا، تو وہ حاصل رشک ہے، چاہے راستہ چلنے والا کسی خیال اور نظریہ کا ہو مگر رسولؐ کا جمالِ حقیقیت آرا دیکھ کر بھی تقویٰ حاصل نہ ہو تو شرف سے، فضیلت نہیں ہے لیکن اگر بے دیکھے بھی انسان تقویٰ کے جوہر سے آراستہ ہوگیا تو فضیلت اسی شخص کے لئے ہوگی، ہاں شرف کے ساتھ فضیلت بھی ہو، پیغمبرؐ سے قرب یا قرابت بھی ہو، اور تقویٰ بھی بحدِ کمال ہو تو کیا کہنا۔

اس کے بعد جس طرح ''اتقاکم'' سے کسی خاص زمانے والا اور خاص وقت والا مراد نہیں۔ اس طرح اس میں کسی خاص طرح کی عبادت کی قید بھی نہیں ہے مثلاً 'اتقاکم' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو سب سے زیادہ نمازیں پڑھے تاکہ تجارت پیشہ افراد اور کاشتکار کہیں کہ ہم اس منزل کو حاصل نہیں کر سکتے، ہم سب سے زیادہ نمازیں پڑھیں تو ہمارا کاروبار ختم ہوجائے۔ یہ بھی نہیں کہ زیادہ سے زیادہ روزے رکھے تاکہ جن کی عمر بیماری میں یا سفر میں زیادہ صرف ہوئی وہ کہہ سکیں کہ ہم تو اس منزل سے محروم ہیں۔ یہ بھی معنی نہیں کہ جہاد زیادہ کرے تاکہ جب شرائط جہاد نہ ہوں تو کہیں کہ ہم اس منزل کو حاصل نہیں کر سکتے۔

''اتقا'' میں کسی عبادت کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر ایک کے ماحول حالات فراہم شدہ شرائط اور درپیش آمدہ مواقع سب کے ساتھ جو اس کے فرائض پاتے ہوں۔ ان کی مکمل طور پر بجا آوری کرتا ہے، تو وہ تقویٰ کی منزل پر فائز ہے اور نظر الٰہی میں اسی عزت کا حامل ہے جو اس کے مرتبۂ تقویٰ کے لحاظ سے اس کو حاصل ہونا چاہئے۔

یہ فرائض باعتبار حالات واقعات مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے ماحول کے لحاظ سے اس منزل تقویٰ کو حاصل کرسکتا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایۂ فضیلت واعزاز ہے، خواہ وہ صاحبِ دولت ہو یا فقیر اور خواہ نسب کے اعتبار سے نظرِ عوام میں بلند ہو یا پست۔

مساوات

دنیا نے افرادِ انسانی میں تفریق کی مختلف خلیجیں قائم کر دی تھیں۔ ایک تفرقہ اپنے اور پرائے کا تھا، ان کا اصول یہ تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ناحق کا کوئی سوال نہیں، اگر اپنی قوم اور قبیلے اور جماعت کا کوئی آدمی ہے تو وہ امداد کا مستحق ہے، چاہے غلطی پر ہو اور جو غیر ہے وہ امداد کا مستحق نہیں۔ اس کے خلاف ہر اقدام کے لئے تیار رہو اس لئے کہ وہ تمہارا ہم قوم اور ہم قبیلہ نہیں۔ یہ تھا ان کا نظریہ جسے ان کے شاعر نے اس طرح کہا ہے، کہ

''وہ اپنے بھائی سے جب مدد کے لئے پکارتا ہے یہ دریافت نہیں کرتا کہ اس کے قول پر کوئی دلیل و برہان ہے یا نہیں، بس آنکھ بند کر کے اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں، چاہے

حق پر ہو، چاہے باطل پر۔"

ایک مستقل تفرقہ ہوا اپنے اور پرائے کی حیثیت سے، پھر حقوق انسانی میں بڑے اور چھوٹے کا فرق قرار دیا، یہاں تک کہ تعزیرات کے قانون میں اس حد تک تفریق کہ اگر چھوٹا بڑے کو مار ڈالے تو چھوٹے کی جان کی قیمت اتنی نہیں کہ وہ اس بڑے کا عوض بن سکے، لہٰذا قصاص میں اس کے قبیلہ کے اور آدمی جو مجرم نہیں اور جنہیں شاید اس خونِ ناحق کی خبر بھی نہ ہو وہ بلائے جائیں۔ اب جتنا اس مقتول کا خون وزنی ہو اور جتنے تول میں اس کے مقابل میں چڑھیں، اتنے قتل کئے جائیں تب جا کر اس کا معاوضہ ہو، لیکن اگر بڑے نے چھوٹے کو قتل کر دیا تو بڑے کی جان نہیں لی جا سکتی۔ اس لئے کہ چھوٹے کی جان کم قیمت ہے۔ سو، پچاس روپے بس اس سے دلوا دیئے جائیں گے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

اسلام نے آ کر ان دونوں تفریقوں کو مٹایا۔

حق کے بارے میں اپنے اور پرائے کی تفریق نہیں۔

حق، حق ہے، چاہے اس کا علمبردار اپنا ہو یا پرایا۔

باطل، باطل ہے، چاہے اس کا حمایتی یگانہ ہو یا بیگانہ۔

ظالم، ظالم ہے، چاہے عزیز ہو چاہے غیر۔

مظلوم ہمدردی کا مستحق ہے، چاہے اپنا شناسا ہو اور چاہے اجنبی۔

یہ اپنے اور پرائے کا احساس تو جذبات کا تقاضہ ہوتا ہے اور حق جذبات کا پابند نہیں ہے۔

"لو اتبع الحقّ اَھوآء ھم لفسدت السّمٰوات والارض۔"

ترجمہ: "اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو آسمان و زمین میں فساد پیدا ہو جائے۔"

ان کو مختلف صورتوں سے ذہن نشین کرایا، چنانچہ اسی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ انہیں کا فقرہ لے کر اس کے معنی بدل دیئے۔ ان کا مقولہ تھا کہ **"انصر اخاک ظالماً اَوْ مظلوماً"** اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو اور چاہے مظلوم۔"

حضرت پیغمبر اسلامؐ کے سامنے اس کا ذکر ہوا، آپ نے فرمایا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم۔ پھر اس کی تشریح فرمائی کہ اگر بھائی مظلوم ہو تو اس کی مدد یہ ہے کہ ظلم کو اس سے دفع کرو، اور اگر ظالم ہے تو حقیقی مدد اس کی یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کو ظلم سے روک دو۔

اسی طرح یہ اعلان کر دیا کہ قانون میں بڑے اور چھوٹے کی تفریق کے کوئی معنی نہیں۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

"القوی عندی ضعیف حتی اخذ الحق منه والضعیف صندص تری حتّیٰ اخذالحق له۔"

اس کسوٹی پر جانچئے۔ دریائے تمدّن کے عمل کو، کیا جرائم اب بھی یکساں سمجھے جاتے ہیں؟ نہیں، وہی جرم چھوٹا کرے تو فوراً شکنجہ قانون میں لے لیا جائے، اور اگر بڑا کرے تو وہ جرم اس لئے ہلکا ہے کہ اس عمل میں لانے والا بڑا آدمی ہے۔ چھوٹا آدمی کسی کو قتل کر ڈالے تو اس کی سزا پھانسی ہے اور بڑا کسی کو قتل کرے اور مجرم ثابت بھی ہو جائے تو ممکن ہے اس کی سزا صرف اختتامِ عدالت تک بیٹھا رہنا ہی قرار دیا جائے مگر اسلام کے عدل کی ہمہ گیری وہ ہے جسے امیر المومنینؑ ان الفاظ میں پیش فرما رہے ہیں "کہ جو کمزور ہے وہ میرے یہاں اس وقت تک طاقتور ہے جب تک کہ اس کا حق نہ لے لیا جائے، اور جو طاقتور ہے وہ کمزور ہے جب تک کہ اس سے حق کو برآمد نہ کر لیا جائے۔ جب تک کہ حق کا معاملہ نہیں ہے اپنی جگہ وہ طاقتور اور یہ ضعیف سہی، مگر جہاں حق کا سوال ہوا اب کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی بلکہ طاقتور اس لئے کمزور ہے کہ دوسرے کا مطالبہ اس کے ذمہ ہے اور کمزور اس لئے طاقتور ہے کہ خود اس کا حق دوسرے پر عائد ہے۔"

حق کے بارے میں نہ عزیز اور غیر کا کوئی امتیاز، اور نہ طاقتور اور کمزور کی کوئی تفریق ہے۔

مشہور بات ہے کہ حضرت علیؑ سے ان کے بڑے بھائی عقیل نے بچوں کی پریشانی کا اظہار کر کے سوال کیا کہ جتنا ملتا ہے

اسے کچھ زیادہ دیا جائے۔ یہ بچوں کے لئے کافی نہیں۔ کیا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ وہ دل نہیں رکھتے تھے جو ایک چچا کا ہوتا ہے؟ کیا انہیں وہ الفت نہ تھی جو ایک چچا کو بھتیجوں سے ہونا چاہئے یقینا آپ کو تکلیف ہوئی، صدمہ اور ملال ہوا۔ تاثّرات سب یہی پیدا ہوئے مگر جواب میں فرمایا: ''میں بس اتنا کرسکتا ہوں کہ اپنا حصّہ بھی آپ کو دے دوں۔ عقیل کہتے ہیں: ''میری اتنے میں بسر نہ ہوگی۔'' آپ نے فرمایا: ''میں دوسروں کا حق آپ کو دے دوں، یہ کس طرح ممکن ہے؟''

زیادہ اصرار بڑھا تو ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ لوہے کو آگ میں گرم کر کے عقیل کے جسم کے قریب لے جانے لگے، وہ تڑپ گئے اور کہا کہ تم تو مجھے جلائے دیتے ہو، فرمایا: ''آپ اس آگ کی تاب نہیں لاسکتے اور چاہتے ہیں کہ میں دوسروں کے حقوق کاٹ کر اپنے لئے آخرت کی آگ کا سامان کروں۔ ایک دن فرمایا، اچھا نصف شب کے بعد آیئے گا۔'' ممکن ہے کہ جناب عقیل کو خیال ہوا ہو کہ شاید کچھ بضیط اور مرحمت فرمائیں گے۔ نصب شب کے بعد آئے تو امیرالمومنینؑ ان کو بازار میں لے گئے، بازار بند ہو چکا تھا، دوکانیں مقفل تھیں، فرمایا: ''اس وقت بظاہر کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ قفل توڑ کے جس دوکان سے چاہیے، ضرورت بھر لے لیجئے۔'' عقیل نے کہا: ''کیسے ممکن ہے کہ میں چوری کروں'' فرمایا: ''آپ کو ایک آدمی کی چوری کرنے میں عذر ہے، اور میرے لئے چاہتے ہیں کہ میں دوسروں کے حقوق لے کر سب مسلمانوں کا چور بنوں۔''

یہ تو حقوق کے بارے میں مساوات تھی اپنی طرح مراتبِ فضیلت میں اس کا لحاظ نہیں کہ کس قوم کا شخص ہے اور کس ملک کا فرد ہے۔

اس وقت جب عرب اپنے کو عرب اور تمام دنیا کو عجم کہتے تھے۔ عرب کے معنی ہیں قوتِ اظہار رکھنے والا، اور عجم کے معنی گونگا۔ انسان حیوان مطلق ہے اور جتنے جانور ہیں وہ حیوانِ عجم کہلاتے ہیں۔ یعنی بولیاں تو بولتے ہیں مگر بات نہیں کرتے، اسی طرح ان کے نزدیک عرب تھے ناطق اور غیرعرب آوازیں تو نکالتے تھے مگر قوت نطق سے محروم تھے، اسی لئے نام ان کا عجم رکھا۔ اور طلسم اقتدار ہے کہ جو لقب انہوں نے دیا اسے دنیا نے بھی قبول کرلیا اور غیرعرب کا نام ہی ہوگیا عجم۔

اب جو اتنا احساس تفوق رکھتے ہوں، انھیں پیغمبر یہ اعلان سنائیں کہ **''لافخر للقرشی علیٰ القرشی و لا للعربی علی غیر العربی کلّکم اولادادم''** کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر، اور عرب کو غیرعرب پر، تم سب آدم کی اولاد ہو۔

کتنا بڑا انقلاب ''لاالٰہ'' سے عرب کو یہی تو مخاصمت تھی، یہ تعلیم لاالٰہ ہی کے سرچشمہ سے پھوٹ رہی تھی کیونکہ اس ''الٰہ'' سے فقط سونا، چاندی، پیتل، لکڑی، پتھر اور لوہے کے بت مراد نہ تھے، اگر فقط یہ بت ہی مراد ہوتے تو حرج نہ تھا۔ عرب کو بتوں سے کوئی اتنی محبت نہ تھی کہ وہ ان پر اپنی جان و مال نثار کرنے کو تیار ہوتے، وہ تو کبھی کبھی حلوے کا بت بناتے تھے جب بھوک لگتی اسی کو کھا بھی لیتے تھے۔ مگر عرب ذہین تھا اس نے دیکھا کہ ''لا الٰہ'' کے تحت میں جس طرح لات وہبل، منات وعزیٰ آتے ہیں اسی طرح ابوجہل، ابولہب اور ابوسفیان بھی ہیں، وہ آدمی بھی جو قانونِ الٰہی کے خلاف اقتدار جمائے ہوا یک الٰہ باطل کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے یہ ''لا الٰہ'' جس طرح ان بتوں کو توڑ کر گراتا ہے۔ اسی طرح ان غلط خداؤں کو بھی تخت اقتدار سے نیچے اتارتا ہے۔ ہر فرعون، نمرود اور یزید کو مسند حکومت سے ہٹانے کا اعلان کرتا ہے، کوئی بھی ہو جو احکامِ خدا کے خلاف اپنی اطاعت کرانا چاہے، وہ اس لاالٰہ کی نفی میں داخل ہے۔

جب یہ معیار قائم ہوا کہ بڑے خاندانی عرب کی عزت نہیں۔ بہت بڑے دولتمند کی عزت نہیں۔ کسی صاحبِ تخت و تاج کی عزت نہیں' عزت ہے ایک نیکوکار کی، چاہے وہ کسی بڑے خاندان کا نہ ہو عزّت ہے ایک پارسا کی، چاہے وہ نان شبینہ سے بھی مطمئن نہ ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی عرب منزلِ تقوی میں پیچھے ہے تو ذلیل ہے اور اگر کوئی غیرعرب آگے ہے تو عزت

دار ہے۔

اس تعلیم کو رسولؐ نے اپنے عمل سے مجسّم شکل میں پیش کر دیا۔ بڑے بڑے عرب جو قرشی تھے، خاندانی تھے ان کو ویسی سندیں نہ ملیں جیسی غیر ملک کے سلمان فارسی کو مل گئیں۔ ان کی اصطلاح میں عجم تھے مگر رسولؐ کے یہاں انہوں نے وہ عزت حاصل کی جو بہت سے عزیزوں کو بھی نہ ملی۔

حدیث میں ہے: "ان الجنّة لتشتاق الیٰ ثلٰثة سلمان و ابی ذر و المقداد" عموماً ایک مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ جنّت کا مشتاق ہوتا ہے مگر رسولؐ فرماتے ہیں کہ تین شخص وہ ہیں جن کا بہشت مشتاق ہے۔ وہ کون؟ سلمان و ابوذر، مقداد۔ ان میں سب سے مقدم سلمان ہیں، جو پردیس کے رہنے والے اور عجمی النسل تھے۔ ابوذر اور مقداد بھی کوئی دولتمند لوگوں میں نہ تھے۔ ان کو کردار کی بنا پر یہ عزت بخشنا نظریہ جاہلیت پر ضرب کاری تھی۔

سلمان کے بارے میں پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا: "سلمان منا اهل البیت" یہ منزل کسی قرشی عرب کو نہ ملی جو سلمان کو حاصل ہوئی۔

کہاں عرب کی وہ ذہنیت کہ ہمارے سوا کوئی بات نہیں کر سکتا اور کہاں یہ کہ رسولؐ نے مؤذن کا عہدہ بلال حبشی کو دے دیا اب عام مسلمانوں کی نگاہ میں مؤذّن کا عہدہ وقیع نہ رہا، نہ سہی مگر مذہبی اعتبار سے رواجی ذہنیت کے ماتحت مؤذن ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سوتے ہوؤں کو جگانے والا، غافلوں کو ہشیار بنانے والا اور اس اعتبار سے کہ صلوٰۃ معراجِ مومن ہے یوں کہنا چاہئے کہ مؤذن اللہ کی بارگاہ میں اذن باریابی دینے والا ہے۔ حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت نمازیوں سے پہلے مؤذّن کو اجر دیا جائے گا۔

یہ منزل ہے مؤذّن کی۔ یہ بلند عہدہ بلال کے سپرد کیا جاتا ہے۔

تبلیغی نقطۂ نظر سے امام مسجد بنانا وہ اِفادیت نہ رکھتا تھا جو مؤذن مقرر کرنا، کیونکہ امام کو تو وہی دیکھے گا جو مسجد کے اندر آئے، محراب کی طرف نظر ڈالے، مگر مؤذن کی صدا راہ گذر سے سننے والے بھی سنیں گے۔ یہ مؤذن مقرر کرنا نہ تھا بلکہ مساواتِ اسلامی کا ایک علم نصب کرنا تھا۔

سب سے مشکل مسئلہ شادی اور بیاہ کا ہوتا ہے، یہ وہ کٹھن مرحلہ ہے جسے اسلامی تعلیم کے چودہ سو سال بعد بھی آج تک مسلمان حل نہیں کر سکے ہیں، حل کیونکر ہو؟ اسلامی تہذیب باقی کہاں رکھی گئی، مسلمان جہاں گئے وہاں کا تمدّن لیا، باعتبار مملکت فاتح ہوئے اور باعتبار تمدّن مفتوح ہوئے۔

اسلامی تعلیم کے کچھ مٹے ہوئے نقوش کے ساتھ ملکی تہذیبوں کو ملا کر ایک گنگا جمنی تہذیب بنائی گئی۔ اس طرح ایران گئے تو وہاں کے اخلاق عادات، خصائل کے ساتھ کچھ اپنا ملا کر ایک تمدّن بنا لیا، وہ مسلم ایرانی تمدّن کہا جا سکتا ہے مگر اسلامی تمدّن تو نہیں ہے، ہندوستان آئے تو کچھ یہاں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج کو لے کر اپنے کچھ تعلیمات کے ساتھ شریک کر لیا نتیجہ یہ ہوا کہ شادیوں میں ایجاب و قبول تو اسلامی رہا، باقی سب رسم و رواج ہندوستان کے، شریعت کا قانون۔ ان کے یہاں بدل سکتا ہے مگر اس رواجی شریعت کا اصول ان کے نزدیک ٹل نہیں سکتا اس طرح ایک "مسلم ہندوستانی تمدّن" بن گیا۔

زبان اپنی مذہبی اگر باقی رکھی ہوتی تو "عربی" ہوتی۔ بخاطر ارباب وطن زبان کو چھوڑا۔ پہلے فارسی اختیار کی، پھر اس میں ہندوستانی الفاظ شریک کر کے اردو کی ایجاد کی۔ خود اس اردو کا اختیار کرنا بخاطر احباب تھا۔ پھر اب یہ "خاطر دوستان" جہاں تک کھینچ کر لے جانا چاہتی ہے اس پر فریاد کی کیا ضرورت ہے۔

اسلامی سادگی کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہے کہ شادیاں ایسی گرانبار بن گئی ہیں کہ لڑکیاں بیٹھی رہیں مگر اتنا روپیہ کہاں سے آئے کہ شادی ہو۔ عرب لڑکیوں کو ایک دم میں زندہ در گور کرتے تھے، اور یہاں لڑکیوں کو مدّت العمر زندہ در گور رکھا جاتا ہے۔ شریعت کا جو قانون ہے "ایجاب و قبول" اس کے لئے روپے کی

ضرورت نہ تھی۔ یہ رسم ورواج کے غلط نتائج ہیں جو یہ روز بدد کھاتے ہیں۔

اسی طرح شادی میں برابر اور بے برابر کا سوال ہے جو چودہ ۱۴ سو سال بعد بھی غیر حل شدہ نظر آتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نومسلم کو مشکل ہوتی ہے کہ اس کے سابق ہم مذہب اس کی لڑکی اس لئے نہیں لیتے کہ وہ اب مسلمان ہے اور مسلم اس لئے نہیں لیتے کہ وہ پہلے ایک دوسری قوم کا تھا۔

مگر رسولؐ اتنے بڑے اہم مسئلہ کو عملی طور سے اپنے سامنے حل کر گئے۔اپنی پھوپھی زاد بہن جناب زینبؑ بنت جحش کا عقد آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے کر دیا اور دوسری پھوپھی زاد بہن صبیعہ بنت حارث ابن عبدالمطلب کا عقد مقداد بن اسود کندی سے کر دیا۔

اسی طرح پیغمبرؐ نے اپنی ہر تعلیم کو عمل میں لا کر دکھا دیا کہ یہ تعلیمیں صرف کاغذی نہیں ہیں بلکہ زندہ حقیقت کی صورت میں تمہارے آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب اگر دنیا نے بلکہ خود اسلام کے نام لیواؤں نے اس تعلیم کو پورے طور پر نہیں یاد رکھا تو یہ اپنا قصور ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اقوال اور اعمال میں تعلیم اسلام ایسی گم ہوگئی ہے کہ پتہ چلانا دشوار ہے جیسے ہزاروں سنگریزوں میں ایک گوہر نایاب مخفی ہو۔

مساوات میں سب سے مشکل اپنی ذات کے ساتھ مساوات برتنا ہے، پیغمبرؐ نے عمل کی دنیا میں اسے بھی دکھا دیا۔

مرض الموت ہے، بیماری کے عالم میں مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں، اعلان ہوتا ہے کہ رسولؐ خطبہ ارشاد فرمائیں گے، چنانچہ مسلمان جمع ہوئے، حضرت منبر پر تشریف لے گئے۔ اعلان فرمایا کہ:

''عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ مجھ کو بلایا جائے اور میں اس آواز پر لبیک کہوں، اس طرح اپنی وفات کا قرب ظاہر فرمایا، پھر کہا: ''دیکھو اگر کسی کو میرے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو ابھی میں زندہ ہوں، مجھ سے اس کا بدلہ لے لے۔''

یہ اعلان کرنا کسی دوسرے کا کام نہ تھا، کوئی بڑا آدمی ہو وہ اول تو تصوّر ہی نہیں کرتا کہ اس نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوگی۔ وہ تو سمجھتا ہے کہ ہم جو کریں وہ ہمارا حق ہے، نوکر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد کبھی یہی غور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہم بے محل تو خفا نہیں ہوئے تھے، اگر اتفاق سے احساس پیدا ہو بھی جائے تو اس کا اس ملازم پر ظاہر کرنا تو بالکل وقار کے خلاف معلوم ہوگا۔

بلاشبہ مذہبی طور پر کسی شخص کو دوسروں پر وہ فوقیت حاصل نہیں جو رسولؐ کو عنداللہ افراد امت پر ہے، مگر حضرت محمد مصطفیٰؐ کو تو اپنی تعلیم میں اپنے عمل سے روح پھونکنا ہے۔

فرماتے ہیں:

''دیکھو میرے ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے۔''

مجمع میں سے ایک شخص سوادہ بن قیس کھڑے ہوگئے اور کہا: ''یارسولؐ اللہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضور ناقہ پر تشریف لئے جارہے تھے۔ ناقہ نے چلنے میں کوتاہی کی، آپ نے تازیانہ کو جنبش دی کہ تنبیہ فرمائیں۔ میں قریب سے گذر رہا تھا، وہ تازیانہ میری پشت پر پڑ گیا۔اس سے مجھے تکلیف ہوئی۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مستغیث کے بیان میں خود مستغاث الیہ کی صفائی موجود تھی۔ وہ خود کہہ رہا تھا کہ آپ ناقہ کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے، مجھے مارنے کا قصد نہ تھا۔ خود راستہ چلنے والے کا بھی قصور ہوسکتا ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر رسولؐ کی عدالت میں یہ استغاثہ کسی اور کے خلاف دائر ہوتا تو صرف مستغیث کے بیان ہی پر فریق مخالف کو بری کر دیتے، مگر چونکہ استغاثہ خود اپنے خلاف ہے، آپ اپنی جائز صفائی بھی پیش نہیں کرتے۔ اگر ایسا کرتے تو متعصّب لوگ کہتے کہ اعلان تو کر دیا تھا مگر جب معاملہ پیش ہوا تو حیلے حوالے کرنے لگے۔

آپ نے یہ سن کر بلال مؤذن کو پکارا، اور فرمایا کہ

بقیہ---------صفحہ ۴۲ پر

سیاست رائج کی جائے تو بھی اختلافات پیدا ہوں گے کیونکہ سیاست ہماری خارجی، بلکہ ظاہری زندگی میں بندش پیدا کرسکتی ہے،لیکن داخلی زندگی اس کے دسترس سے باہر ہے محرکات نفس پر سیاست بندھ نہیں باندھ سکتی ہے وہ صرف مذہب ہی ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں زندگی کی ہر ہر سانس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ آخر میں وہ مذہب ہی حق ہے جو تمام دیگر مذاہب پر چھا جائے اور نقطہ اتحاد ہوسکتا ہے۔

بقیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسلام اور انسانیت

جاؤ ہمارا تازیانہ لے آؤ۔ بلال تازیانہ لائے۔حضرت نے سوادہ کی طرف بڑھا دیا، فرمایا: ''لو اپنا بدلہ لے لو'' سوادہ نے عرض کیا کہ جس وقت تازیانہ میری پشت پر پڑا تھا تو میری پشت پر لباس نہ تھا۔ اس لئے مجھے تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔حضرت نے یہ سن کر پیراہن پشت مبارکہ سے ہٹا دیا اور کہا تمہیں جتنی تکلیف پہنچی ہے اسی طرح بدلا پورا کرو۔'' پیراہن ہٹنے پر مہرِ نبوت نمایاں ہوئی، سوادہ مہرِ نبوت کے بوسے لینے لگے اور کہا کیا مجال ہے کہ میں اس جسم سے تازیانہ کو مس کروں۔'' حضرت نے فرمایا: ''یہ مروّت وتکلف کا موقع نہیں ہے یا بدلا لو یا کہو کہ میں نے معاف کیا۔'' سوادہ نے کہا: ''خداوندا میں نے معاف کیا۔''

رسولؐ نے ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا: ''پروردگارا! سوادہ نے تیرے حبیب کو معاف کیا تو اس کے گناہوں کو معاف کردے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبرؐ کی انتہائی عزیز بیٹی جن کا بجائے خود یہ امتیاز تھا کہ رسولؐ تعظیم کو کھڑے ہوتے تھے لیکن دوسروں کے ساتھ مساوات کی یہ منزل کہ جب وہ کنیز اپنی بیٹی کو عطا کی جس کا نام فضہ تھا تو یہ ہدایت فرمادی کہ دیکھو پورا گھر کا کام اس پر نہ چھوڑ دینا بلکہ ایک دن گھر کا کام تم کرنا، ایک دن فضہ سے لینا، یہ مساوات اسلامی کا تحفّظ تھا۔

اب یہ ہوتا تھا کہ ایک دن فضّہ کھانا پکاتی تھیں اور گھر کی بی بی بیٹھ کر نوش فرماتی تھیں اور ایک دن شاہزادی عالمیاں پکاتی تھیں اور لونڈی بیٹھ کر کھاتی تھی۔ یہ رسولؐ کے گھر کا تمدّن تھا۔ اگر یہ عام ہوتا تو مسلمانوں کی دنیا جنّت ہوتی یا نہیں؟

حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس وقت جب آپ شہنشاہ عالم اسلام ہیں، قنبر کو ساتھ لے کر بازار تشریف لے جاتے ہیں۔ دو پیراہن خریدتے ہیں ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا۔ سات درہم والا پیرہن قنبر کو دیتے ہیں، پانچ درہم کا خود پہنتے ہیں، قنبر نے عرض کیا: ''مولا! یہ کچھ بہتر ہے اسے آپ زیبِ تن فرمائیں۔''

ہم میں کا کوئی بڑا آدمی اوّل تو ایسا کرتا ہی کیوں اور اگر کوئی زعیم ملّت قسم کا شخص ایسا کرتا بھی تو جو ہیں غلام نے کہا تھا کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں؟ وہ فوراً ایک بسیط تقریر کے ساتھ اپنے مصلحانہ مقصد کا پھرہرا ہوا میں اڑانے لگتا کہ میں چاہتا ہوں کہ غلاموں کے درجہ کو بلند کروں، مساوات کا علم اونچا کروں۔ امیر المومنینؑ کے پیش نظر یقیناً یہی امور تھے لیکن اگر آپ یہ سب کچھ کہتے تو اس جواب میں خود عدمِ مساوات مضمر تھی یعنی اس سے قنبر میں احساس غلامی پیدا ہوجاتا۔ لہٰذا قنبر کو ویسا جواب دیا جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا: نہیں تم نوعمر ہو، تمہیں یہ اچھا معلوم ہوگا۔ میرا کیا، میں یہ پہن لوں گا۔

یہ سیرتیں وہ ہیں جن کو عالم انسانیت کے سامنے پیش کرکے ہم دعوت دے سکتے ہیں کہ وہ ان کی پیروی کرے تو دنیا میں جو افراتفری، جو کشمکش، جو نفسا نفسی ہے، وہ سب دور ہوجائیں، اور انسان عملی طور پر اس مقصد کی تکمیل کرسکے جو اس کی رفعت کے شایان شان ہے۔

